حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ

اور

فاضل بریلوی

کے

ترجمۂ قرآن کا تقابلی جائزہ

تصنیف

فخرِ اہلِ سنّت حضرت مولانا قاری عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ
اُستاذِ حدیث و تفسیر جامعہ مدنیہ، لاہور

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ

اور

فاضلِ بریلوی

کے

ترجمۂ قرآن کا تقابلی جائزہ



تصنیف

فخرِ اہلِ سُنّت حضرت مولانا قاری عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ

اُستاذِ حدیث وتفسیر جامعہ مدنیہ لاہور

انجمن ارشاد المسلمین

۱۴- بہاولپور روڈ، مزنگ لاہور

نام کتاب : حضرت شیخ الہندؒ اور فاضل بریلوی کے تراجم کا تقابلی جائزہ

مرتب : قاری عبدالرشید صاحبؒ

کل صفحات : ۱۶۸

تاریخ طباعت : شعبان ۱۴۳۳ھ/ جولائی ۲۰۱۲ء

پریس : زاہد بشیر پرنٹرز

ناشر : انجمن ارشاد المسلمین ۶ بی شاداب کالونی لاہور (0300-8099774)

تعداد : ایک ہزار

قیمت :

ملنے کے پتے:

مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار، لاہور
مکتبہ رشیدیہ مقدس مسجد، کراچی
کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار، راولپنڈی
کتب خانہ مجیدیہ بوہڑ گیٹ، ملتان
مکتبہ اسلامیہ کوتوالی چوک، فیصل آباد
یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور
مکتبہ سراجیہ، سرگودھا

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش نظر کتاب حضرت شیخ الہندؒ اور فاضل بریلوی کے تراجم کا تقابلی جائزہ کے مصنف حضرت مولانا قاری عبدالرشید صاحبؒ کی مختصر سوانح کتاب کے شروع میں درج کی جا رہی ہے تاکہ قارئین کو کتاب کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب کے علمی مقام کا بھی کچھ اندازہ ہو سکے۔

ولادت | حضرت قاری صاحب مرحوم کی ولادت ۲۲ صفر المظفر ۱۳۶۹ھ / ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء بروز جمعرات ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک علمی و دینی گھرانے میں ہوئی، آپکے والد محترم حضرت مولانا مفتی عبدالحمید صاحب مدظلہ العالی فاضل دیوبند ہیں اور علوم جدیدہ و قدیمہ میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔

تعلیم و تربیت | قاری صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت از اول تا آخر آپکے والد محترم دام ظلہ کے زیر سایہ ہوئی، اوکاڑہ میں قرآن پاک حفظ کیا، حفظ قرآن سے فراغت کے بعد والد ماجد کے ہمراہ لاہور چلے آئے۔ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں جامعہ مدنیہ لاہور میں جو اسوقت بڑے بڑے اساطین علم و فضل کا مرکز تھا آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا، معقولات و منقولات کی اکثر کتب والد ماجد سے پڑھیں، دس سالہ تعلیمی دور گزار کر ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ درس نظامی کے علاوہ آپ نے ۱۹۷۱ء میں فاضل عربی اور ۱۹۷۲ء میں میٹرک کی از خود تیاری کر کے امتحان دیا اور سندات حاصل کیں۔

بیعت و سلوک خلافت و اجازت | آپ زمانہ طالب علمی ہی میں حضرت مولانا عبدالحکیم صاحبؒ (متوفی ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء) خلیفہ مجاز شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے تھے، حضرت مولانا نے ۱۹۷۳ء میں وفات سے چند روز پیشتر قاری صاحب مرحوم کو انتہائی محبت کے ساتھ گلے لگا کر خلافت عطا فرمائی اور بیعت کی اجازت دی۔

تدریس | ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء میں آپ نے اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث و مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور کے حکم پر جامعہ مدنیہ ہی میں تدریس کا آغاز فرمایا اور ابتدائی درجات سے لے کر انتہائی درجے تک کی تقریباً تمام کتابیں بڑی کامیابی کے ساتھ پڑھائیں۔ آپ نے مسلسل بیس برس تک تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اس دور میں آپ سے ہزاروں تشنگانِ علوم نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض پایا۔

احقاق حق و ابطال باطل | اللہ تعالیٰ نے آپکو مسلک حق کی صحیح ترجمانی و اشاعت اور باطل کی تردید و بیخ کنی کے لیے منتخب فرمایا تھا چنانچہ آپ نے انتہائی قلیل عرصہ حیات میں اس سلسلہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جنہیں دیکھ کر عقل محو حیرت رہ جاتی ہے۔ اس پُرخار وادی میں آپکو ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ دور دراز کے سفر بھی کئے، ساری ساری رات جاگ کر لوگوں کی ذہن سازی بھی کی، ہفتہ وار، ماہوار درس بھی دیئے۔ بہت دفعہ تحریری و تقریری مناظرے بھی کئے، تھانہ کچہری تک نوبت بھی پہنچی، اپنے پرایوں کی باتیں بھی سننی پڑیں تاہم آپ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے احقاق حق و ابطال باطل کا فریضہ انجام دیتے رہے اور بزبان حال کہتے رہے ؎ تندئ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

انجمن ارشاد المسلمین و جمعیت اہلسنّت کا قیام | اکابر علماء دیوبند کے مسلک و موقف سے (جو کہ قرآن و سنت پر مبنی اور افراط و تفریط سے پاک انتہائی معتدل مسلک ہے) آپ کو عشق کی حد تک لگاؤ اور باطل و اہل باطل سے شدید نفرت تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ قوم فرق باطلہ سے ہٹ کر صحیح معنیٰ میں دین حق کی پرستار اور بدعات سے بچ کر نور سُنّت سے منور ہو، اس کے لیے آپ نے ۱۹۷۷ء میں نوجوانوں پر مشتمل ایک تنظیم انجمن ارشاد المسلمین قائم کی اس تنظیم سے علمی اور عملی طور پر بہت فائدہ ہوا۔ بہت سے نوجوانوں کو راہ ہدایت نصیب ہوئی اور بہت سی نادر و نایاب کتب طبع ہو کر عوام تک پہنچیں، پھر ۱۹۸۴ء میں ائمہ مساجد اور علماء اہلسنت کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے دین حق کی اشاعت اور باطل کی سرکوبی کے لیے ایک تنظیم "جمعیت اہل سنت" کے نام سے قائم کی اس تنظیم سے آپ نے علمی طور پر علماء و ائمہ کرام کو مسلح کیا اور بہت سی اہم کتابیں طبع کر کے ان تک پہنچائیں۔

تصنیف و تالیف | قاری صاحب مرحوم کو لکھنے لکھانے کا شوق زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ طالب علمی کے دور ہی میں آپ نے بہت سے مضامین لکھے جو "انوار مدینہ" میں شائع ہوئے بعد کو یہ ذوق بڑھتا گیا اور انتہائی مصروفیات کے باوجود آپ بلند پایہ مضامین لکھتے رہے جو سہ ماہی مجلہ "منہاج" اور "فیضان مدینہ" میں چھپتے رہے [illegible] کے خلاف جو کتب آپ نے شائع کی تھیں ان میں سے بعض کتب پر انتہائی

وقیع مقدمات تحریر فرمائے جن میں سے "الشہاب الثاقب"، رسائل چاند پوری جلد اول اور "حفظ الایمان" کے مقدمات قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ درج ذیل کتب آپکی یادگار ہیں۔

(۱) تحریک پاکستان اور بریلویوں کا کردار۔ (۲) آئینہ بریلویت۔

(۳) فاضل بریلوی کا حافظہ۔ (۴) مروجہ محفل میلاد۔

(۵) حضرت شیخ الہند اور فاضل بریلوی کے تراجم کا تقابلی جائزہ۔

موخر الذکر کتاب جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے وہ حضرت قاری صاحبؒ مرحوم کی تصانیف میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اس سے حضرت قاری صاحب کا علمی مقام آپ کی ذکاوت و ذہانت، جودت طبع اور نقادی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں آپ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن (م ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) اور اہل بدعت کے مجدد احمد رضا خان صاحب بریلوی کے تراجم کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ سورۂ فاتحہ مکمل اور سورۂ بقرہ کی ۳۷ آیات پر محیط ہے۔ اس جائزہ میں آپ نے واضح کیا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ میں جہاں نظم قرآنی کی ترتیب و ترکیب کو ملحوظ رکھا ہے وہیں اسکی فصاحت و بلاغت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا نیز آپ نے اپنی ترجمانی کے بجائے اسلاف کی تفسیر و تعبیر کا خاص خیال رکھا ہے اور اپنے عقائد کی اشاعت کے بجائے سلف صالحین کے عقائد پر اعتماد فرمایا ہے جبکہ احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ میں بیسیوں قسم کے سقم پائے جاتے ہیں۔ ۱؎ اس میں نہ قرآنی ترتیب و ترکیب باقی رہتی ہے۔ ۲؎ نہ اس کی فصاحت و بلاغت ۳؎ نہ اس میں اسلاف کی تفسیر و تعبیر کا خیال رکھا گیا ہے۔ ۴؎ نہ سلف صالحین کے عقائد پر اعتماد وغیرہ وغیرہ۔

یاد رہے کہ حضرت قاری صاحب مرحوم اپنی تصانیف "انوار احمد" کے قلمی نام سے لکھتے تھے اور وہ ان کی زندگی میں اسی نام سے چھپتی تھیں۔

وفات حسرت آیات ۱۸ شوال المکرم ۱۴۱۳ھ/۲۲ مارچ ۱۹۹۲ء بروز بدھ بعد از نماز ظہر مسجد میں بالکل اچانک آپ کی وفات ہوئی اور جمعرات کی صبح قبرستان میانی صاحب میں حضرت طاہر بندگیؒ کے جوار اور حضرت مولانا سید حامد میاںؒ کی پائنتی آپ کی تدفین ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سببِ تالیف

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰة والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

اما بعد! کچھ عرصہ سے بریلوی حضرات کی طرف سے احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ قرآن "کنز الایمان"، کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔ اخبارات میں کچھ اس قسم کے مضامین چھپ رہے ہیں کہ "کنز الایمان"، کے علاوہ بقیہ تمام مروجہ اردو تراجم قرآن پاک، نہ صرف یہ کہ حسن و خوبی میں "کنز الایمان"، کی ٹکر کے نہیں ہیں بلکہ گمراہ کن ہیں۔ اسی طرح پاک و ہند کے مختلف رسائل و جرائد میں "کنز الایمان"، کے محاسن و فضائل پر آرٹیکل لکھے جا رہے ہیں۔ اس موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسائل اور پمفلٹ شائع کر کے انہیں مفت تقسیم کیا جا رہا ہے مثلاً مرکزی مجلس رضا لاہور، کی طرف سے دو رسائے "محاسن کنز الایمان"، اور "ضیاء کنز الایمان"، مفت تقسیم کیے جا رہے ہیں۔

"محاسن کنز الایمان"، کے پیش لفظ میں "کنز الایمان"، کے محاسن بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:- "امام رازی اگر اسے دیکھ پاتے تو بے اختیار آفریں کہتے۔ ابن عطار اور جبائی کے

سامنے یہ ترجمہ ہوتا تو شاید اعتزال سے توبہ کر لیتے۔ خاتمہ تصوف سے جس طرح اعلیٰ حضرت نے آیات کے بطن کو ترجمہ میں ڈھالا ہے غزالی ہوتے تو اسے دیکھ کر وجد کرتے، ابن عربی شاد کام ہوتے اور سہروردی دعائیں دیتے۔ ترجمہ کے ضمن میں جو فقہی نگینے لائے ہیں۔ اگر امام اعظم پر پیش کیے جاتے تو یقیناً "مرحبا" کہتے اور اگر ابن عابدین اور سید طحطاوی کے سامنے یہ فقہی آبگینے ہوتے تو اعلیٰ حضرت سے تلمذ کی آرزو کرتے۔ قرآن مجید کے علوم و فنون، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی تاویل و تفسیر پر جو شخص نگاہ رکھتا ہو وہ جب اس ترجمہ کو پڑھے گا تو یقیناً سوچے گا کہ اگر قرآن اردو میں اترا ہوتا تو یہ عبارت اس کے قریب تر ہوتی اور جو فصاحت زبان سے آشنا ہو اسے کہنا پڑے گا کہ اس ترجمہ میں زبان و بیان کی بلاغت اعجاز کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۔ [1]

ایک اور صاحب "کنزالایمان" کی تعریف و توصیف میں مزید آگے بڑھ کر یہاں تک لکھتے ہیں کہ :-

"اور اس کی مثال نہ عربی زبان میں ہے نہ فارسی میں اور نہ ہی اردو میں"۔ [2]

نیز دیگر مترجمین کو "بصیرتِ ایمانی سے محروم، تائیدِ ربانی سے محروم نادار مترجمین، گمراہ مترجمین، مطلق العنان مترجمین اور بے حیا و بے شرم" ایسے القابات سے نوازنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ [3]

---

[1] "محاسن کنزالایمان"، ص ۱۰۹ طبع بار سوم، [2] "الشاہ احمد رضا" ص ۸۲، [3] "انوار رضا" ص ۵۳-۵۵

ان وجوہات کی بنا پر بارہا خیال ہوا کہ "کنزالایمان" کا تحقیقی جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس کے بارے میں کیے جانے والے ان بلند بانگ دعاوی میں کہاں تک صداقت ہے؟ اس لیے متعدد اہل علم و فضل کی خدمت میں اپنا خیال ظاہر کیا اور ان سے یہ استدعا کی کہ اہل سنّت اور فرقہ رضاخانیہ بریلوی کے مابین اختلافی مسائل سے بالاتر ہو کر صرف بحیثیت ترجمۂ قرآن اس کا جائزہ لیا جائے کہ صاحبِ کنزالایمان" ترجمہ قرآن پاک کی دقیق و عمیق ہمہ جہتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ لیکن وہ حضرات اس کی ضرورت و اہمیت سے کلی اتفاق کرنے کے باوجود اپنی شدید ہمہ وقتی مصروفیات کے باعث اس کام کے لیے تاحال وقت نہ نکال سکے۔ ادھر اس کام کی اہمیت کا شدید تقاضا تھا کہ اس سلسلہ میں کوئی تاخیر و تعویق روا نہ رکھی جائے اس لیے راقم الحروف کو خود اس کام میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ وباللہ التوفیق۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ کے ترجمہ کا تقابلی جائزہ

صاحب "کنز الایمان" نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے۔ "اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا"۔ یہ ترجمہ کئی وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً: اس لیے کہ "رحمٰن" اور "رحیم" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں چنانچہ تفسیر بیضاوی میں ہے۔

الرحمٰن الرحیم اسمان بنیا للمبالغة من رحم [1]: رحمٰن اور رحیم دو اسم ہیں جو رَحِمَ سے مبالغہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ لیکن صاحب "کنز الایمان" نے رحیم کا جو ترجمہ پیش کیا ہے (یعنی رحمت والا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کو اس کا علم ہی نہیں کہ مفسرین تو اس لفظ "رحیم" میں مبالغہ کے معنی بتا رہے ہیں۔ اس لفظ کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا نے فرمایا ہے یعنی نہایت رحم والا۔

ثانیاً: لفظ رحمٰن کا اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور مخلوق پر جائز نہیں ہے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی شریف میں ہے۔

لانه صار كالعلم من حيث انه لا يوصف — لفظ رحمٰن علم کے مانند ہے کیونکہ اس لفظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے

۱ تفسیر بیضاوی ص۵ طبع مجتبائی دہلی۔

به غيره [1] — علاوہ اور کوئی موصوف نہیں ہو سکتا۔

اس لیے لفظ رحمٰن کا ترجمہ ایسا ہونا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوق پر نہ بولا جا سکتا ہو۔ لیکن صاحب "کنز الایمان" نے اس کا ترجمہ "بہت مہربان" کیا ہے جو بلا تامل مخلوق پر بولا جا سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ لفظ رحمٰن کا یہ ترجمہ صحیح نہیں بلکہ اس کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے فرمایا ہے، یعنی بے حد مہربان۔ کیونکہ ایسا مہربان جس کی مہربانی کی واقعۃً کوئی حد و نہایت نہ ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں ہے اس لیے کہ مخلوق اور اس کی تمام صفات محدود ہیں۔ ایسی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے جس کی ذات وصفات سب غیر متناہی و لامحدود ہیں۔

ثالثاً: "بسم اللہ" میں جار مجرور کا متعلق محذوف ہے اور اس متعلق کو "بسم اللہ" سے پہلے یا بعد دونوں طرح مقدر مانا جا سکتا ہے [2]۔ لیکن متعلق مؤخر ماننے کی صورت میں حصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے [3]۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ متعلق مؤخر ماننے کی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا "اللہ ہی کے نام سے شروع" الخ۔ لیکن چونکہ احمد رضا خاں صاحب نے حصر کے ساتھ ترجمہ نہیں کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے جار مجرور کا متعلق مؤخر نہیں بلکہ مقدم مانا ہے، اس صورت میں عبارت یوں ہوگی۔ ابدأ بسم اللہ [4] اس صورت میں عبارت کے مطابق ترجمہ وہ نہیں رہتا جو صاحب "کنز الایمان"

۱ بیضاوی شریف ص۵، تفسیر قرطبی ص۱/۱۰۶ طبع مصر، معالم التنزیل علی ہامش الخازن ص۱۸ طبع مصر، تفسیر کشاف مع حاشیہ سید شریف جرجانی ص۱/۴۲ وغیرہ۔

۲ تفسیر خازن ص۱/۱ ، ۳ تفسیر کشاف ص۱/۲۹، ۳۰ ، طبع بیروت

۴ تفسیر خازن ص۱/۱ ، معالم التنزیل علی ہامش الخازن ص۱/۱

کے کیا ہے بلکہ عبارت کے مطابق وہ ترجمہ قرار پاتا ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کیا ہے، یعنی "شروع اللہ کے نام سے الخ"۔

رابعاً: بلاغت کی مشہور درسی کتاب "مختصر المعانی" میں "الحمد للہ" کے اندر لفظ الحمد کو اسم جلالہ اللہ پر مقدم کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ چونکہ یہ مقام مقام حمد تھا اس لیے الحمد کو اسم جلالہ اللہ پر مقدم کیا گیا ہے جیسا کہ آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اسم رب سے پہلے لفظ "اقراء" کو اسی لیے لایا گیا ہے کہ وہ مقام، مقام قرارت[1] ہے۔ گویا بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ جس طرح مقامِ حمد میں لفظ "اللہ" پر "حمد" کو مقدم کیا گیا ہے اور مقام قرأت میں "اقراء" کو اسم رب پر مقدم کیا گیا ہے اسی طرح مقام شروع میں لفظ "شروع" کو اسم جلالہ اللہ پر مقدم کیا جائے کیونکہ بلاغت مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جب ہم اسی قاعدے کے مطابق احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس اصولِ بلاغت سے غافل ہیں اس لیے بسم اللہ کا ترجمہ کرتے ہیں "اللہ کے نام سے شروع"۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ ترجمہ فرمایا ہے "شروع اللہ کے نام سے"۔

سورۃ الفاتحہ

صاحب "کنز الایمان" نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا" یہ ترجمہ بھی کئی وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

[1] مختصر المعانی ص ۵

اَوَّلاً: "حمد" کے معنیٰ ہیں "الثناء باللسان[1] الخ یعنی زبان سے تعریف کرنا۔ چونکہ حمد کے معنیٰ تعریف کرنے کے ہیں اس لیے مفسرین ذکر کرتے ہیں کہ "حمد" کے پائے جانے کے لیے پانچ امور کا پایا جانا ضروری ہے۔ (۱) محمود بہ (۲) محمود علیہ (۳) حامد (۴) محمود (۵) وہ الفاظ جن کے ذریعہ حمد کی جائے۔ مثلاً زید نے عمرو کو کچھ رقم ہبہ کی۔ جواباً عمرو نے زید کی تعریف میں کہا کہ "زید بہت بڑا عالم ہے"۔ اس میں عمرو حامد ہے زید محمود ہے۔ اور وہ رقم جو باعثِ حمد بنی ہے محمود علیہ ہے اور زید کی صفت علم جس کا اظہار کیا گیا ہے وہ محمود بہ ہے اور یہ جملہ کہ "زید بہت بڑا عالم ہے الفاظ حمد ہیں۔ بہرحال ثابت ہو گیا کہ حمد کے معنیٰ خوبی نہیں خوبی پر تعریف کرنے کے ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ "صاحبِ کنز الایمان" حمد کا ترجمہ "تعریف" کی بجائے "خوبی" کر رہے ہیں۔ حالانکہ معمولی فہم والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ تعریف اور "خوبی" ایک چیز نہیں ہیں۔ "خوبی" حمد نہیں محمود بہ ہوتی ہے لیکن صاحب "کنز الایمان" نے الحمد کا ترجمہ سب خوبیاں کر دیا۔ اس کا اس مقام پر بہتر ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے۔ یعنی "سب تعریفیں" (واضح ہو کہ اگرچہ مجازاً "حمد کا معنیٰ "خوبی" سے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بلاوجہ حقیقی معنیٰ سے عدول مستحسن نہیں۔

ثانیاً: لفظ "لِلّٰه" کا ترجمہ صاحب "کنز الایمان" نے کیا ہے "اللہ کو" عربی میں "ل" حرفِ جر ہے جس کے معنیٰ "لیے" اور "واسطے" کے ہوتے ہیں اس لیے جدید فصیح اردو میں "الحمد للہ" کا ترجمہ یہ نہیں ہے جو صاحب کنز الایمان نے کیا ہے کہ "سب خوبیاں اللہ کو" بلکہ اس کا فصیح اردو ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "سب تعریفیں

[1] تفسیر مظہری ص ۴ ج ۱، تفسیر کشاف ص ۴۷ ج ۱، روح المعانی وغیرہ۔

اللہ کے لیے ہیں"۔ لفظ الحمد للہ میں لام جارہ کا ترجمہ لفظ "کو" سے کرنا اردو کی فصاحت کو بٹہ لگانا ہے۔

ثالثاً: لفظ رب "تربیت" سے مشتق ہے اور اس کے حقیقی معنیٰ "پالنے والے" اور "پروردگار" کے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ اور متعدد معانی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک مجازی معنیٰ "مالک" بھی ہیں[1]۔ کسی لفظ کے حقیقی معنیٰ ترک کر کے بلا وجہ معنیٰ مجازی مراد لینا بہتر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب "روح المعانی" نے رب کے معنیٰ "پروردگار" اور "پالنے والا" کو بہ نسبت "مالک" کے راجح قرار دیا ہے[2]۔ امام رازیؒ نے بھی اس کو تربیت اور پالنے ہی کے معنیٰ میں لیا ہے[3] اور "روح البیان" میں بھی رب کو تربیت اور اصلاح ہی کے معنیٰ میں لیا گیا ہے۔ نیز "تفسیر بیضاوی" اور "ابو السعود" میں بھی اس کے اصل معنیٰ "تربیت" ہی کے لکھے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس صاحب "کشاف" علامہ زمخشری معتزلی نے "رب" کے معنیٰ "مالک" بتلائے ہیں جو معنیٰ حقیقی سے بلا وجہ معنیٰ مجازی کی طرف رجوع کے باعث مرجوح ہیں۔ بعد کے بعض مفسرین نے زمخشری معتزلی کے اتباع میں رب کے معنیٰ "مالک" کئے ہیں۔ لیکن اس موقع پر حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ معتزلہ کے مقابلہ میں اہل سنت کے مشہور زمانہ وکیل امام المتکلمین امام رازیؒ کے نقش قدم پر ہیں، جب کہ صاحب کنز الایمان جناب احمد رضا خان صاحب علامہ زمخشری معتزلی کے راستہ پر۔ حضرت شیخ الہند کا ترجمہ ملاحظہ ہو "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں

---

[1] روح المعانی ص ۷۷ ج ۱
[2] روح المعانی ص ۷۷ ج ۱
[3] تفسیر کبیر مع ابی السعود ص ۱۱۸ ج ۱

جو پالنے والا سارے جہان کا"۔

رابعاً: "عالَم" کی مراد بیان کرتے ہوئے مفسرین نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ بھی ہے اس کو "عالَم" کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے ماتحت متعدد اجناس و انواع ہیں ان کے اعتبار سے اس مقام پر لفظ "عالم" کو جمع استعمال فرمایا گیا ہے۔ تقریباً تمام مفسرین کے نزدیک "عالَم" سے مراد اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام موجودات ہیں اور اسی کو وہ اصح قرار دیتے ہیں۔ اور "عالم" کے اس معنیٰ کے علاوہ باقی معانی کو ضعیف قرار دیتے ہوئے یا تو ذکر ہی نہیں کرتے اور یا پھر بصیغۂ تمریض ذکر کرتے ہیں۔

"عالَم" کے جن معانی کو مفسرین ضعیف قرار دیتے ہیں وہ کئی ہیں مثلاً ایک یہ ہے کہ "عالم" سے مراد اہل علم اور اہل عقل ہیں جو تین گروہ ہیں (۱) انسان (۲) ملائکہ (۳) جن۔ بعض نے شیاطین کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ "عالَم" سے مراد صرف انسان ہیں۔ تیسرے یہ کہ "عالم" سے مراد جنات اور انسان ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جمہور اہل سنت مفسرین کے نزدیک عالم سے سارا جہان مراد ہے جب کہ علامہ زمخشری معتزلی صاحب "کشاف" کے نزدیک اہل علم و عقل یعنی فرشتے، جنات اور انسان مراد ہیں۔

صاحب "کنز الایمان" (احمد رضا خان صاحب نے) العالمین کا ترجمہ "جہان والے" کر کے زمخشری معتزلی کے پسندیدہ معنیٰ کو اختیار کر کے جمہور اہل سنت مفسرین کا راستہ ترک کر دیا ہے۔ احمد رضا خان صاحب کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے جمہور اہل سنت مفسرین کی تفسیر کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے۔ چنانچہ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں

"جو پالنے والا سارے جہان کا"

رہی یہ بات کہ صاحب "کنزالایمان" کے ترجمہ "جہان والے" سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ "جہان والوں" سے علامہ زمخشری کی طرح اہل علم و عقل مراد لے رہے ہیں۔

تو گزارش ہے کہ "جہان والے" کے دو ہی مطلب بن سکتے ہیں۔ ایک جہان کی ملکیت رکھنے والے، جیسے کہا جاتا ہے زمین والے، مکان والے، کارخانے والے وغیرہ۔ دوسرے جہان میں رہنے والے، اور یہ دونوں ہی ذوی العقول کے اوصاف ہیں کیونکہ غیر ذوی العقول نہ تو کسی چیز کے مالک ہو سکتے ہیں اور نہ ان کی طرف بلا قرینہ کسی جگہ رہنے کی نسبت کی جا سکتی ہے مثلاً کسی درخت کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فلاں جگہ رہتا ہے یا فلاں مسجد فلاں جگہ رہتی ہے

بہرحال اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ صاحب "کنزالایمان" نے "العالمین" کے ترجمہ میں معتزلہ کا قول اختیار کیا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ نے جمہور اہلسنت کا

آیت (۲) الرحمٰن الرحیم ان دونوں لفظوں کے ترجمہ میں وہی نقائص ہیں جو ہم نے تسمیہ کے ترجمہ کے ذیل میں ذکر کر دیئے ہیں۔

آیت (۳) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا ترجمہ خان صاحب نے یہ کیا ہے "روز جزا کا مالک"۔ یہ ترجمہ عبارتِ قرآنی کی ترتیب کے موافق نہیں۔ جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے صحتِ ترجمہ کے ساتھ ساتھ الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں۔ "مالک روز جزا کا"۔ اس ترجمہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ میں الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بھی تا بحدِ امکان ملحوظ رکھتے ہیں۔

آیت (۴) اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اس آیت کا ترجمہ خان صاحب

نے یہ کیا ہے کہ "ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔"

یہ ترجمہ بھی محلِ نظر ہے۔

اولاً: اس لئے کہ ایاک نعبد اور ایاک نستعین دونوں جملہ خبریہ ہیں لیکن ان کا ترجمہ جو خان صاحب نے کیا ہے وہ آج کل کی فصیح اردو کے لحاظ سے جملہ استفہامیہ انشائیہ بن جاتا ہے مثلاً جانے یا آنے والا شخص اجازت لیتے ہوئے کہتا ہے "میں جاؤں"، "میں آؤں"۔ گویا خان صاحب اللہ تعالیٰ سے پوچھ رہے ہیں کہ "ہم تجھی کو پوجیں؟ تجھی سے مدد چاہیں؟ یعنی ہم اے خدا تجھی کو پوجیں یا اوروں کو بھی پوج سکتے ہیں؟ اور اے خدا! ہم تجھی سے مدد مانگیں یا اوروں سے مدد مانگ سکتے ہیں؟۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ ترجمہ انتہائی غلط اور گمراہ کن ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے "تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ اس ترجمہ سے کوئی غلط اور گمراہ کن ایہام نہیں ہوتا۔

ثانیاً: ہندی کا لفظ "پوجنا"، "پوجا" کا مصدر ہے اور "پوجا" بھی ہندی کا لفظ ہے جس کا ایک معنیٰ "ہندوؤں کی عبادت کا طریقہ" بھی ہے[1] اس لیے "پوجا" کے لفظ سے ذہن کا پنڈتوں، مہنتوں، پروہتوں، جوگیوں اور بھگتوں کے طریقۂ عبادت کی طرف منتقل ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ حالانکہ ہندوؤں کا تصورِ عبادت، اہل اسلام کے تصورِ عبادت سے یکسر مختلف ہے۔ اس لیے "عبادت" کا ترجمہ کسی ایسے لفظ سے کرنا زیادہ موزوں اور بہتر ہوگا جس سے غیر مسلموں کے تصورِ عبادت کی بُو نہ آتی ہو۔ اس نقص و عیب سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے۔ یعنی "تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ احمد رضا خان صاحب کا

[1] فرہنگ آصفیہ ص ۵۳۸ ج ۱ مطبوعہ مکتبہ حسن سہیل لاہور

ذہن نارسا ان باریک امور کا لحاظ نہ رکھ سکا۔

آیت (۵) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۔ اس کا ترجمہ خان صاحب نے یہ کیا ہے "ہم کو سیدھا راستہ چلا"۔

اولاً ہدایت کے اصل معنیٰ دلالت و رہنمائی کے ہیں۔ چنانچہ "خان صاحب" نے متعدد مقامات پر "ہدایت" کا ترجمہ "راہ دکھانے" سے کیا ہے مثلاً

(۱) سورۃ انعام میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے متعدد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کر کے فرمایا ہے۔ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ [1] (ترجمہ خان صاحب) اور ہم نے انہیں چن لیا اور سیدھی راہ دکھائی۔

(۲) حضرت موسیٰ وہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ [2] (ترجمہ خان صاحب) اور ان کو سیدھی راہ دکھائی۔

(۳) حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا۔ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا [3] (ترجمہ خان صاحب) اور تمہیں سیدھی راہ دکھا دے۔

یہ بات معلوم کر لینے کے بعد کہ ہدایت کے اصل معنیٰ راہ دکھانے کے ہیں۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جس طرح محض راہ دیکھ لینا شریعت کی نگاہ میں قابلِ اعتبار نہیں جب تک اس پر چلا نہ جائے اور عمل نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علم رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے گمراہ قرار دیا

[1] الانعام : ۸۷ [2] الصافات : ۱۱۸ [3] سورۃ فتح : ۲

ہے کہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ اُس پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ [1] (ترجمہ خان صاحب) اور اللہ نے اسے باوصف علم کے گمراہ کیا۔

اور اسی طرح اس "عمل" کا شرعًا اعتبار نہیں جس کی پشت پر علم صحیح نہ ہو ارشادِ خداوندی ہے۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ [2] یعنی اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کی رہنمائی کے بغیر اپنی خواہش کا اتباع کرے۔

بہرحال ثابت ہوگیا کہ جس طرح سیدھی راہ دیکھ لینا بغیر اس پر چلنے کے کافی نہیں اسی طرح بغیر علم صحیح کے اس پر چلنا بھی معتبر نہیں۔

اس تمام تفصیل کے بعد معلوم ہوگیا کہ آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا ترجمہ اگر "سیدھا راستہ چلانے" سے کیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ سیدھے راستہ پر ایسا چلانا جو سیدھے راستہ کے علم صحیح پر مبنی ہو اور اگر اس کا ترجمہ "بتلا ہم کو راہ سیدھی" سے کیا جائے تو بھی اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اسی طرح سیدھی راہ بتلانا جو اس پر چلنے کو بھی متلزم ہو۔

یہاں سے ثابت ہوگیا کہ اس آیت میں "راستہ چلانا" اور "راستہ بتلانا" دونوں طرح ترجمہ کرنا درست ہے اور ہر ترجمہ اپنی مکمل تصحیح میں دوسرے کا محتاج (یعنی چلانا بتلانے کا اور بتلانا چلانے کا) احمد رضا خان صاحب "راستہ چلانا" سے ترجمہ کرتے ہیں اور حضرت شیخ الہند "راستہ بتلانا" سے اب دیکھنا یہ ہے کہ باوجودیکہ حضرت شیخ الہند کے سامنے "راستہ چلا" والا ترجمہ موجود تھا، پھر آپ نے اس کا ترجمہ "راستہ چلا" کی بجائے

[1] الجاثیہ : ۲۳ [2] القصص : ۵۰

"راستہ بتلا"، کیوں کر دیا اور آپ کے نکتہ رس ذہن نے اس میں کون سا ایسا نکتہ محسوس فرمایا جس کے باعث آپ نے پہلے ترجمہ کی بجائے دوسرا ترجمہ اختیار فرمایا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کرام نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے باہمی ربط کی ایک بڑی اور اہم وجہ ربط یہ ذکر فرمائی ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جو دعاءِ ہدایت کی گئی ہے اس کا جواب ابتداء سورۂ بقرہ سے آخر قرآن تک ہے یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (الآیۃ) تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (الآیۃ) اب اس ہماری دعا اور اس کے جواب میں مطابقت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب حضرت شیخ الہندؒ والا ترجمہ کیا جائے ورنہ سوال و دعا اور اس کے جواب میں مطابقت مفقود ہو جاتی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ سورۂ فاتحہ کی آیت دعاء کا ترجمہ یہ فرماتے ہیں۔ "بتلا ہم کو راہ سیدھی" اور اس کے جواب کا ترجمہ بایں الفاظ فرماتے ہیں۔" اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتلاتی ہے ڈر والوں کو" نیز حضرت شیخ الہندؒ نے حاشیہ میں" فائدہ نمبر۲" کے ذیل میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "یہاں سے اخیر قرآن تک جواب ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا جو سوال بندوں کی طرف سے ہوا تھا۔

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ شیخ الہندؒ نے "اِهْدِنَا" کا ترجمہ بتلا فرما کر کس طرح سورۂ فاتحہ کا اپنے مابعد کے ساتھ اور مابعد کا سورۂ فاتحہ کے ساتھ ربط و تعلق واضح فرما دیا۔ لیکن اس کے برعکس احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کے مطابق یہ ربط واضح نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں دعا کے اندر تو

ذکر ہوا صراطِ مستقیم پر چلانے کا اور جواب ملا کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، جو راستہ دکھاتی ہے۔ یہاں سے حضرت شیخ الہند کی دقتِ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً: احمد رضا خان صاحب نے الفاظِ قرآنی کی ترتیب کو بھی اس ترجمہ میں مدّ نظر نہیں رکھا۔ لکھتے ہیں" اور ہم کو سیدھا راستہ چلا"۔ جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ ترجمہ فرمایا ہے۔ "بتلا ہم کو سیدھی راہ" یعنی اِهْدِ کا ترجمہ "بتلا" اور نَا کا ترجمہ "ہم کو" اور الصِّرَاطَ کا "راہ" اور الْمُسْتَقِيمَ کا "سیدھی"۔ یہاں سے بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بھی تا بحدِ امکان ملحوظ رکھتے ہیں۔"

آیت (٦) صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ خان صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔" راستہ اُن کا جن پر تو نے احسان کیا۔ نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا"۔

یہ ترجمہ بھی متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اولاً: اس لیے کہ اَلَّذِينَ اسم موصول ہے جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن خان صاحب نے ترجمہ میں اس کا قطعاً خیال نہیں رکھا جس کے باعث ذہن غیر ذوی العقول کے راستوں کی طرف بھی منتقل ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا احسان کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف ذوی العقول کے ساتھ ہی خاص ہو بلکہ اس کے احسانات تو ساری مخلوق کو محیط ہیں۔ اس لیے اس کا زیادہ صحیح ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے یعنی "راہ ان لوگوں کی"۔

ثانیاً: لفظ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ترجمہ خان صاحب نے "احسان" سے فرمایا ہے۔ اگر وہ ذرا سا بھی تدبّر سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ

"انعام" اور "احسان" کے استعمال میں بڑا فرق ہے۔ "احسان" تو کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو کہا جاتا ہے خواہ وہ اچھا سلوک کچھ دے کر ہو یا کچھ دیئے بغیر۔ اس کے برعکس "انعام" کا اطلاق کچھ دینے کی صورت میں ہوگا چنانچہ "مفردات امام راغب" میں ہے۔ والاحسان اعم من الانعام" یعنی احسان عام ہے انعام سے [1]

احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کے برعکس شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے۔ وہ فرماتے ہیں "راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا ...." بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ میں ایک اور لطافت ہے جو اس آیت پر نظر کرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام کردہ لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ آیت مبارکہ یہ ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا [2]

(ترجمہ خان صاحب) "اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور نیک لوگ۔ یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ کافی ہے جاننے والا۔"

اس آیت مبارکہ کو دیکھ کر ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ خود اس کو اپنا فضل قرار دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود خان صاحب نے اس مقام پر لفظ اَنْعَمَ کا ترجمہ اسی مناسبت کی بناء پر "فضل" سے کیا ہے لیکن

[1] "مفردات امام راغب بذیل مادہ حسن" [2] النساء: ٦٩

افسوس کہ احمد رضا خان صاحب کو سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کرتے وقت یہ آیت مدنظر نہ رہی۔ اور یہیں سے حضرت شیخ الہندؒ کی دُوربینی بھی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کسی آیت کے ترجمہ کے وقت اس سے متعلقہ دیگر قرآنی آیات کو کس طرح ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ سچ ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ثالثاً: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ ترکیب میں اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی "صفت"، یا اس سے "بدل" واقع ہے اور "بدل" بھی "بدل الکل" [1] اور ظاہر ہے کہ صفت موصوف کا مصداق او مدلول نیز بدل الکل اور مبدل منہ کا مصداق ایک ہوتا ہے اس لیے اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا مصداق اور مدلول ایک ہی ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب یا تو اس آیت مبارکہ کی ترکیب سے بالکل ناواقف ہیں اور یا پھر علم نحو کے اس ابتدائی مسئلہ سے آگاہ نہیں ہیں کہ بدل الکل اور اس کے مبدل منہ کا مصداق و مدلول نیز صفت، و موصوف کا مصداق و مدلول ایک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خان صاحب اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ کا مصداق علیحدہ علیحدہ قرار دے کر یہ ترجمہ فرماتے ہیں۔ "راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا۔" اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ ان تمام فنی امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ترجمہ فرماتے ہیں "راہ ان لوگوں کی جن پر تو

[1] روح المعانی ص ۹۴ ج ۱

نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

رابعاً: خان صاحب نے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کا ترجمہ کرتے وقت اس آیت کو مدنظر نہ رکھا جو سورۂ آل عمران میں یہود پر غضب سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ۔ ؎۱ (الآیۃ) یعنی "اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے"۔ خان صاحب کا ترجمہ دیکھ کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس مقام پر جو غضب کا ذکر ہے اس سے کس کا غضب مراد ہے (خدا کا یا کسی اور کا) لیکن حضرت شیخ الہند رح کا ترجمہ اس سقم سے پاک ہے۔ وہ فرماتے ہیں .... جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے"۔

سورۃ البقرۃ

آیت (۱) الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ۔ خان صاحب بریلوی نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ "وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں۔

اس رضاخانی ترجمہ کی عمدگی اور خوبی بطور نمونہ متعدد مضامین میں بریلوی حضرات کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے ایک بات انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ذرا ذٰلِکَ کے ترجمہ کا تقابلی مطالعہ بھی کیجئے۔ معمولی عربی دان بھی یہ جانتا

؎۱ آل عمران : ۱۱۲

ہے کہ ذٰلِکَ اشارہ قریب نہیں اشارہ بعید ہے، مگر افسوس ہے کہ اکثر مترجمین اس کا ترجمہ "یہ" کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اسے اپنے اصل معنوں میں لے کر اس کا ترجمہ "وہ" کیا ہے اور عبارت کا حُسن بھی قائم رکھا ہے ؎۱

ہم اس کے جواب میں اس وقت صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں پہلی یہ کہ مشہور مفسر حافظ ابن کثیر رح فرماتے ہیں۔

قال ابن جریج قال ابن عباسؓ "ذالک الکتاب" ای ھذا الکتاب وکذا قال مجاھد وعکرمۃ وسعید بن جبیر والسدی ومقاتل ابن حیان وزید بن اسلم و ابن جریج ان ذالک بمعنی ھذا۔ ؎۲

ابن جریج فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "ذالک الکتاب" ھذا الکتاب (یہ کتاب) کے معنی میں ہے اور ایسے ہی فرمایا ہے۔ مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، سدی، مقاتل بن حیان، زید بن اسلم اور ابن جریج نے کہ "ذالک" ھذا (یہ) کے معنیٰ میں ہے۔

گویا قرونِ اولیٰ کے آٹھ جلیل القدر ائمہ تفسیر متفقہ طور پر فرما رہے ہیں کہ "ذالک الکتاب" ھذا الکتاب کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی اس کا ترجمہ "وہ کتاب" نہیں بلکہ اس کا ترجمہ "یہ کتاب" ہے۔ اب احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کی بے جا وکالت کرنے والے حضرات ارشاد فرمائیں کہ یہ ائمہ تفسیر جن پر تفسیر قرآن کا بہت حد تک مدار ہے کیا معمولی عربی جانتے تھے یا نہیں؟

؎۱ محاسن کنز الایمان ص ۲۸، ۲۹، طبع بار سوم۔ ؎۲ تفسیر ابن کثیر ج اول ص ۴۰

دوسری بات یہ ہے کہ وہ "معمولی عربی دانی" جس نے احمد رضا خان صاحب سے اس مقام پر "ذالک" کا ترجمہ "یہ" کی بجائے "وہ" کرا دیا۔ کیا اس طفلِ مکتب کی "معمولی عربی دانی" تھی جس نے رٹ رٹ کر کچھ شکلیں یاد کر لیا ہو اور پھر چند ہی لمحات کے بعد وہ سب کچھ زیبِ طاقِ نسیاں ہو گیا ہو؟ ورنہ کیا وجہ ہے کہ درج ذیل مقامات پر اسی لفظ "ذالک" کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے "وہ" کی بجائے "یہ" کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

سورۃ البقرہ آیت ۶۱، ۱۷۶، ۱۷۸، ۲۳۲، ۲۷۵۔ سورۃ آل عمران آیت ۲۴، ۴۴، ۷۵، ۱۱۲، ۱۸۲، ۱۸۶۔ سورۃ النساء آیت ۳، ۲۵، ۳۰، ۷۰، ۱۵۳، ۱۶۹۔ سورۃ المائدہ آیت ۳۳، ۵۴، ۵۸، ۷۸، ۸۲، ۸۵، ۸۹، ۹۷، ۱۰۸۔ سورۃ الانعام آیت ۱۶، ۹۷، ۱۳۲۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۶، ۱۴۶، ۱۷۶۔ سورۃ الانفال آیت ۱۳، ۵۱، ۵۳۔ سورۃ التوبۃ آیت ۶، ۳۰، ۳۶، ۸۰، ۱۲۰۔

سورہ توبہ کے ختم تک تقریباً سوا دس پاروں میں مندرجہ بالا چالیس مقامات پر احمد رضا خان صاحب نے لفظ "ذالک" کا ترجمہ "وہ" کی بجائے "یہ" کیا ہے۔ بطورِ نمونہ پہلے دس پاروں کے رضاخانی ترجمہ سے یہ مثالیں ہم نے پیش کی ہیں۔ اگر ان مقامات پر ذالک کا ترجمہ اسم اشارہ قریب والا کر دینے سے آسمان نہیں پھٹ پڑا زمین نہیں شق ہو گئی اور احمد رضا خان صاحب کی امامت و مجددیت کو بٹہ نہیں لگا تو پھر نہ معلوم جنہوں نے اس مقام پر ذالک کا ترجمہ "یہ" یا "اِس" کر دیا ہے ان کے مبلغِ علم کو ہدفِ تنقید کیوں بنایا جا رہا ہے جب کہ قرونِ اولیٰ کے آٹھ جلیل القدر ائمہ تفسیر سے ان کی تائید میں نہیں بلکہ لغتِ عربی کے مشہور امام "ابو عبیدہ" سے بواسطہ

معمر بن مثنیٰ امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں کہ ذالک الکتاب کا معنیٰ ھذا القرآن ہے۔[1] تفاسیر وغیرہ میں ذالک کا ترجمہ "ھذا" (یہ) سے ہی کیا گیا ہے جب کہ روح المعانی، بیضاوی، کشاف، ابوالسعود، تفسیر کبیر، رُوح البیان اور البحر المحیط وغیرہ تفاسیر میں لفظ ذالک کا ترجمہ کیا ہی نہیں گیا ہے بلکہ ذالک کے متعلق دیگر تحقیقات شروع کر دی گئی ہیں۔ بہر حال جن حضرات مفسرین نے لفظ "ذالک" کا ترجمہ فرمایا ہے انہوں نے ھذا (یہ) سے ہی ترجمہ فرمایا ہے جیسا کہ ائمہ تفسیر کا قول تھا۔

باقی رہا یہ اشکال کہ قرآن میں "اسم اشارہ بعید" قرآن کی عظمت کی خاطر استعمال کیا گیا ہے تو اگر ترجمہ میں اسم اشارہ قریب کا ترجمہ کر دیا جائے تو یہ عظمتِ قرآنی کے خلاف ہو جائے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ ذالک اسم اشارہ بعید لانے کی وجہ کیا ہے؟ جیسا کہ ہم آئندہ قدرے تفصیل سے عرض کریں گے لیکن اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس مقام پر اسم اشارہ بعید عظمتِ قرآنی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے پھر بھی اسم اشارہ قریب والا ترجمہ کرنے سے اس کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ دیکھئے علامہ جلال الدین سیوطیؒ باوجودیکہ اس اسم اشارہ کو تعظیم کے لیے قرار دے رہے ہیں لیکن پھر بھی اس کا ترجمہ "ھذا" ہی سے فرماتے ہیں۔[2]

اس لیے علامہ سلیمان بن عمرؒ حاشیہ جلالین میں ارشاد فرماتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ص۱۵۷ ج۱، ابن کثیر ص۳۹ ج۱، خازن ص۲۷ ج۱، معالم التنزیل علی ہامش الخازن ص۲۷ ج۱، تفسیر مظہری ص۱۷ ج۱، جلالین ص۴ طبع کراچی، فیض القدیر للشوکانی ص۲۱ ج۱، مراح لبید ص۳ ج۱، کتاب الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز علی ہامش مراح لبید ص۳ ج۱، تفسیر طبری ص۷۴ ج۱۔

[2] ملاحظہ ہو جلالین ص۴ طبع کراچی۔

(ای هٰذا) بیان لحاله فی نفس الامر و انه قریب لحضوره وهذا لاینافی بعده رتبة کما سیشیر الیه بقوله والاشارة به للتعظیم۔ ؎

یہ اس کے واقعی اور نفس الامری حال کا بیان ہے اور وہ سامنے موجود ہونے کے باعث قریب ہے اور یہ اس کی عُلُوِّ شان کے منافی نہیں ہے جیساکہ مصنف آگے اپنے اس قول کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ذالك کے ساتھ اشارہ تعظیم کی خاطر ہے

بہرحال ثابت ہوگیا کہ "ذٰلِكَ" کا اشارۂ قریب سے ترجمہ کرنا قرآن کی عظمت کے منافی نہیں ہے اور منافات ہو بھی کیسے سکتی ہے جب کہ خود متعدد آیات میں قرآن پاک کے لیے اسم اشارۂ قریب استعمال کیا گیا ہے مثلاً۔

(۱) وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام آیت ۱۹)

(ترجمہ خان صاحب) اور میری طرف اس قرآن کی وحی ہوئی ہے کہ میں اس سے تمہیں ڈراؤں اور جن جن کو پہنچے

(۲) وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ۔ (الانعام : ۹۳)

(ترجمہ خان صاحب) اور یہ ہے برکت والی کتاب کہ ہم نے اتاری تصدیق فرماتی ان کتابوں کی جو آگے تھیں۔

؎ الفتوحات الالهیة المعروف بہ تفسیر جمل ص ۱۱/ج۱ طبع بیروت

(۳) وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ۔ الانعام : ۱۵۵

(ترجمہ خان صاحب) اور یہ برکت والی کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو

(۴) وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا۔ (الاحقاف : ۱۲)

(ترجمہ خان صاحب) اور یہ کتاب ہے تصدیق فرماتی عربی زبان میں۔

نیز ملاحظہ ہو (۵) سورۂ یونس آیت ۳۷، (۶) سورۂ یوسف آیت ۳، (۷) بنی اسرائیل آیت ۹، ۴۱، ۸۸، ۸۹ - (۸) کہف آیت ۵۴، (۹) الفرقان آیت ۳۰، (۱۰) النمل آیت ۷۶، (۱۱) الروم آیت ۵۸، (۱۲) الزمر آیت ۲۷، (۱۳) الحشر آیت ۲۱۔

کیا "ذالك" کا استعمال یہاں تعظیم کے لیے ہے

یہاں تک یہ تو ثابت ہوچکا کہ ذالك کا ترجمہ هٰذا (یہ) کرنا ہی سلف سے منقول ہے اور جن اردو ترجمہ نگاروں نے اس کا ترجمہ اشارہ قریب سے کیا ہے وہی سلف کی تفسیر کے مطابق ہے اور خان صاحب کا ترجمہ اسلاف کرام کی تفسیر کے مخالف ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ذالك اشارۂ بعید استعمال کیوں کیا گیا؟ تو اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ تفسیر قرطبی میں تقریباً ایک درجن اس کی توجیہات ذکر کی گئی ہیں۔ ؎

لیکن اس قول کا وہاں کوئی ذکر نہیں کہ ذالك کا استعمال اس مقام پر تعظیم کے لیے ہوا ہے اسی طرح دیگر متعدد تفاسیر میں اشارۂ بعید استعمال کرنے کی

؎ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ج۱ ص۱۵۷، ۱۵۸

جانے کے خیال کے لیے راہ ہموار کرتا ہے حالانکہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ قرآنِ پاک کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔ (حم السجدہ ۴۲)

قرآن پاک کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ تو حکمتوں والے سب تعریفوں والے کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ریب وشک جو باطل ہی کی ایک صورت ہے قرآن کے پاس بھی پھٹک نہیں سکتا چہ جائیکہ یہ تصور کہ کفار کے شک وشبہ کے باعث قرآن محل ریب بن سکتا ہے چنانچہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ بریلویوں کے ایک شیخ الحدیث جناب غلام رسول سعیدی صاحب نے اس رضاخانی ترجمہ کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ مسجد گندگی کی جگہ نہیں ہے گو کوئی شخص اپنی بدبختی کے باعث اس میں گندگی لے جائے۔

اس سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح مسجد گندگی ونجاست کا مقام نہ ہونے کے باوجود کوئی بدبخت اس کو نجاست سے آلودہ کر کے نجس وناپاک کر سکتا ہے اسی طرح قرآن پاک شک کی جگہ نہ ہونے کے باوجود کفار نے شک کر کے اس کو مشکوک بنا دیا ہے۔ (العیاذ باللہ)

اس تمام تر تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احمد رضاخان صاحب نے ترجمہ میں (حسب تشریح ومثال سعیدی صاحب) نہ صرف یہ کہ لَارَیْبَ

فِیْہِ کے زورِ کلام کو ختم کر دیا بلکہ اس کو محل ریب مان کر مشکوک بھی قرار دے دیا ہے (العیاذ باللہ)

ثالثاً: یہ بات مدِنظر رہنی چاہیئے کہ علامہ زمخشری معتزلی صاحب کشاف نے اگرچہ جمہور مفسرین کے برعکس اس آیت کا مطلب قرآن کے محلِ ریب ہونے کی نفی قرار دیا ہے لیکن ان کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے جو احمد رضاخان صاحب اور ان کے پیروکار اس آیت کا مطلب بتانے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ صاحب کشاف کی عبارت یہ ہے۔

ما نفی ان احداً لا یرتاب فیہ و انما المنفی کونہ متعلقا للریب و مظنۃ لہ [1]

(یعنی) اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نفی نہیں کی کہ کسی کو اس میں شک نہیں ہے درحقیقت نفی تو کی گئی ہے قرآن کے ساتھ ریب کے متعلق ہونے کی اور قرآن کے مظنۂ ریب ہونے کی

دیکھیے! علامہ نے تو قرآن کے ساتھ ریب کے متعلق ہونے کی بالکل نفی کر دی جب کہ احمد رضاخان صاحب اور بریلویوں کے شیخ الحدیث یہ فرما رہے ہیں کہ جس طرح مسجد گندگی لانے کی جگہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص گندگی لانا چاہے تو گندگی لا کر مسجد کو ناپاک کر دیتا ہے بعینہ اسی طرح قرآن پاک کوئی شک کی جگہ تو نہیں ہے البتہ اگر کوئی بدبخت اس میں شک وشبہ کرتا ہے تو قرآن محل شک وشبہ بن جاتا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ منہ)

رابعاً: خان صاحب کے ترجمہ میں غلطی اس طرح لگی کہ انہوں نے لَارَیْبَ

[1] کشاف ص ۳۴ ج ۱ مطبوعہ ایران

فِیہِ کی ترکیب کو نظر انداز کر دیا۔ اسکی ترکیب یوں ہوگی کہ لَا حرف نفی ہے
جو نفی جنس کے لیے اس جگہ مستعمل ہوا ہے۔ رَیْبَ مسند الیہ اور لائے نفی
جنس کا اسم ہے اور فیہ جار مجرور مل کر کائنٌ[1] یا موجودٌ[2] کے متعلق ہیں
اور کائنٌ یا موجودٌ (دونوں کا مطلب ایک ہی ہے) اپنے متعلق سے مل
کر مسند اور خبر ہے لائے نفی جنس کی۔ پھر لائے نفی جنس اپنے اسم و خبر
سے مل کر جملہ اسمیہ بن جاتا ہے۔

اور کسی بھی جملہ میں ثبوت یا نفی کا تعلق اصل میں مسند اور خبر کے ساتھ ہوتا
ہے گویا اس جملہ کا مقصد قرآن پاک سے وجود ریب کی بالکلیہ نفی کرنا ہے لیکن
احمد رضا خان صاحب نے ترکیب کو نظر انداز کرتے ہوئے بجائے قرآن سے
وجود ریب کی نفی کرنے کے مقام ریب کی نفی کر دی۔ یعنی انہیں ترجمہ کرنا چاہیے
تھا کہ قرآن میں ریب و شک کا کوئی وجود نہیں لیکن انہوں نے ترجمہ کر دیا کہ
"قرآن کوئی شک کی جگہ نہیں"۔ بہر حال یہ غلطی احمد رضا خان صاحب کو صرف
اس لیے لگی کہ انہوں نے قصداً یا لاعلمی میں آیت مذکورہ کی نحوی ترکیب کو
نظر انداز کر دیا۔

خامساً: بریلوی حضرات نے آیت لَا رَیْبَ فِیہِ اور آیت
وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا میں تعارض ثابت کرنے کے لیے یہ جو کہا ہے
کہ اول الذکر آیت سے معلوم ہوا کہ "قرآن مجید جنس ریب کا محل نہیں بنا" اور
دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ "قرآن محل ریب بنا"۔ اس کے جواب میں
عرض ہے کہ یہ بات تو بالکل درست ہے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے
کہ "قرآن مجید جنس ریب کا محل نہیں بنا"۔ لیکن دوسری آیت کا مطلب ہرگز

[1] املاء ما من بہ الرحمٰن ص ۱۱ ج ۱، [2] ابو السعود علی ہامش الکبیر ص ۵۷ ج ۱

وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن محل ریب بنا۔ حاشا و کلا۔
قرآن نہ کبھی محل ریب بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ
خود اس آیت کے معنی سمجھنے میں ریب و شک کا شکار ہو کر محل ریب بنے
ہوئے ہیں۔ خدارا اتنا تو سوچا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ تو ان کفار کا شک میں ہونا
بیان فرما رہے ہیں اور آپ ہیں کہ قرآن میں شک بتائے جا رہے ہیں۔ اگر
کوئی بیمار آدمی کسی میٹھی چیز کو کڑوا کہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کڑواہٹ
جو اسے محسوس ہو رہی ہے یہ خود اس کے اپنے مُنہ کی کڑواہٹ ہے نہ
کہ اس میٹھی چیز کی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی انتہائی سفید چیز کو سبز یا سُرخ
شیشہ لگا کر دیکھے اور کہے کہ وہ چیز سبز یا سُرخ ہے تو کوئی عقلمند آدمی یہ
نہیں کہہ سکتا کہ واقعی یہ سُرخ یا سبز رنگ اُس چیز میں آگیا ہے بلکہ یہی کہا جائیگا
کہ یہ رنگ جو اس کو نظر آ رہا ہے درحقیقت اس شیشہ کا رنگ ہے جو اس
کی آنکھ پر چڑھا ہوا ہے نہ کہ اس سفید چیز کا۔ اسی طرح قرآن میں شک کرنے
والے خود ریب و شک کا شکار ہیں اور یہ ریب و شک ان کے دل و دماغ
پر بالکل اسی طرح محیط ہے جس طرح دیکھنے والے کی آنکھ پر سُرخ یا سبز شیشہ
محیط ہوتا ہے۔

سادساً: اگر لَا رَیْبَ فِیہِ کا وہ ترجمہ جو عام طور پر کیا
جاتا ہے غلط ہے تو بریلوی حضرات ہی ارشاد فرمائیں کہ احمد رضا خان صاحب
نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ آیت اور اُس کا
ترجمہ یہ ہے۔

وَمَا کَانَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ — (ترجمہ خان صاحب) اور اس قرآن کی یہ شان نہیں کہ کوئی اپنی

دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (یونس آیت ۳۷)	طرف سے بنالے بے اللہ کے اتارے۔ ہاں وہ اگلی کتابوں کی تصدیق ہے اور لوح میں جو کچھ لکھا ہے سب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں ہے پروردگار عالم کی طرف سے ہے

بہر حال ثابت ہو گیا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کا رضاخانی ترجمہ " وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں " غلط ترجمہ ہے اس آیت مبارکہ کا صحیح ترجمہ جو اسلاف کرام کی تفسیر اور عربی گرامر کے مطابق ہے وہ وہ ترجمہ ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے فرمایا ہے یعنی " اس کتاب میں کچھ شک نہیں "۔

سابعاً: خان صاحب بریلوی کا ترجمہ میں " جگہ " کا لفظ داخل کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ یہاں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ " جگہ " ہو اگر کہا جائے کہ لفظ " فِيْهِ " سے " جگہ " کا مفہوم اخذ کیا گیا ہے تو جواباً عرض ہے کہ لفظ " فِيْهِ " کا ترجمہ تو مستقلاً آگے موجود ہے کیونکہ احمد رضا خان صاحب آگے فرماتے ہیں۔ " اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو "۔ یہاں پر لفظ " اس میں " ترجمہ ہے " فِيْهِ " کا۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ " جگہ " کا لفظ ترجمہ میں داخل کرنا غلط ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے یہ کیا ہے " اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو "۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اولاً: اس لیے کہ اس میں اختلاف ہے کہ لفظ " فِيْهِ " جملہ " لَا رَيْبَ " کا جزء ہے یا اس کا تعلق " هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ " سے ہے مشہور قول یہ ہے کہ لفظ " فیہ " کو لائے نفی جنس کی خبر قرار دے کر پچھلے جملہ " لاریب " کا جزء قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قول مشہور میں وقف " لاریب " پر نہیں ہے بلکہ " لاریب فِيْهِ " پر کیا جاتا ہے تاکہ لفظ " فیہ " کا جملۂ گزشتہ کا جزء ہونا یعنی لائے نفی جنس کی خبر ہونا خوب واضح ہو جائے لیکن اس قول مشہور کے برعکس ایک روایت شاذہ نافع و عاصم رحمہما اللہ سے یہ بھی ہے کہ " لاریب " پر وقف کیا جائے اور لفظ " فیہ " کو بجائے گزشتہ جملہ کا جزء قرار دینے کے آئندہ جملہ کا جزء قرار دیا جائے[1]

اس اختلاف کو سمجھ لینے کے بعد خان صاحب بریلوی کی یہ غلطی واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے جمہور امت اور سوادِ اعظم کا اتباع کرنے کی بجائے ایک روایت شاذہ کو اپناتے ہوئے اور لفظ " فیہ " کو آئندہ جملہ کا جزء قرار دیتے ہوئے یہ ترجمہ کیا کہ " اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو "۔

ثانیاً: علامہ رشید رضا مصریؒ نے لفظ " لا ریب " پر وقف کرنے اور " فیہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ " کو علیحدہ جملہ مستقلہ قرار دینے کو ضعیف اور نظم قرآنی سے متبادر ہونے والے مفہوم کے خلاف قرار دیتے ہوئے جمہور امت کی قرأت و تفسیر کو راجح ثابت کرنے

---

[1] ملاحظہ ہو فتح القدیر للشوکانی ص ۲۲/ج۱، تفسیر کشاف ص ۱۱۵/ج۱۔

کے لیے اس آیت سے بھی استشہاد کیا ہے جو سورۃ "الم سجدہ" کے شروع میں ہے یعنی "الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ"، کیونکہ اس آیت میں لفظ "فیہ" کا آئندہ سے نہیں بلکہ گزشتہ جملہ سے ہی تعلق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس سے جمہور کی قرأت اور ان کی تفسیر کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔[۱]

ثالثاً: محققین مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کو علیحدہ جملہ بنانا معنوی لحاظ سے بھی اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں کتاب کا مجسم ہدایت ہونا معلوم ہوتا ہے جب کہ دوسری صورت میں کتاب کا ہدایت پر مشتمل ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں جو مبالغہ اور کلام میں زور پایا جاتا ہے وہ دوسری صورت میں مفقود ہے۔[۲]

رابعاً: قرآن پاک میں بارہا قرآن کو "نور" اور "ھدیٰ" قرار دیا گیا ہے مثلاً ملاحظہ ہو سورۃ "البقرۃ"، آیت ۱۸۵، سورۃ "النحل" آیت ۶۴، ۸۹ اور سورۃ "النحل"، آیت ۲ وغیرہ اس سے بھی جمہور کی قرأت و تفسیر کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ "فیہ" کو جملہ گزشتہ کا جز بنایا جائے نہ کہ آئندہ جملہ کا۔

بہر حال ان وجوہات کی بنا پر "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کو جمہور مفسرین نے علیحدہ جملہ قرار دیا ہے۔[۳]

---

[۱] ملاحظہ ہو تفسیر المنار ص ۱۲۴ ج ۱

[۲] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص ۱۶۰ ج ۱، تفسیر بیضاوی ص ۱۷ حاشیہ نمبر ۴۵ حاشیہ کشاف للسید شریف الجرجانی ص ۱۱۵-۱۱۶ ج ۱، تفسیر ابن کثیر ص ۳۹ ج ۱، شیخ زادہ علی البیضاوی ص ۹۷ ج ۱۔

[۳] مثلاً ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی ص ۱۷ و مدارک التنزیل ص ۱۲، ۱۳ ج ۱ و تفسیر مظہری ص ۱۷ ج ۱

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس صورت میں "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کو "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" کی خبر ثانی یا "ھو" محذوف کی خبر بنایا جاتا ہے ملاحظہ ہو املاء ما منّ بہ الرحمٰن ص ۱۰ ج ۱ اور "ھدیٰ" اصل میں "ھاد" کے معنی میں ہے ملاحظہ ہو جلالین ص ۴ وغیرہ۔ تو اس صورت میں زیادہ صحیح ترجمہ وہ قرار پاتا ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے فرمایا ہے یعنی "راہ بتلاتی ہے ڈر والوں کو" جب کہ احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ جمہور مفسرین اور سواد اعظم کی قرأت و تفسیر کے خلاف ہے۔

آیت (۳) الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

اس آیت کا ترجمہ خان صاحب بریلوی نے یہ کیا ہے۔

"وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں۔"

یہ ترجمہ کئی وجوہ سے محل نظر ہے۔

اولاً: لفظ "بالغیب" کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس میں "با"، "تعدیہ" یعنی متعدی بنانے کے لیے ہے اس طرح لفظ "بِالْغَيْبِ"، "يُؤْمِنُوْنَ" کا بواسطہ حرف جر مفعول بن جاتا

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابقہ

و روح البیان ص ۳۰ ج ۱ و اکلیل علی مدارک التنزیل ص ۳۸ ج ۱ و شیخ زادہ علی البیضاوی ص ۸۰ ج ۱ و کشاف ص ۱۲۱ ج ۱ و حاشیہ سیّد شریف علی الکشاف ص ۱۲۲ ج ۱ و تفسیر کبیر ص ۱۶۲ ج ۱ و ابو السعود علی ہامش الکبیر ص ۶۹ ج ۱ و تفسیر خازن ص ۲۷ ج ۱ و تفسیر معالم التنزیل علی ہامش الخازن ص ۲۸ ج ۱، و تفسیر نیشاپوری علی ہامش الطبری ص ۱۲۹ ج ۱ وغیرہ

ہے۔ یہ قول جمہور مفسرین کا ہے۔ اس صورت میں اس کا صحیح ترجمہ وہ ہوگا جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی " جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا"۔

دوسرا قول یہ ہے کہ لفظ " بالغیب"، ترکیب میں مفعول نہیں بلکہ "حال" واقع ہے۔ یعنی ان متقین کا حال ان منافقین کی طرح نہیں ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔	اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو یونہی ہنسی کرتے ہیں۔
(البقرہ ۲: ۱۴)	(ترجمہ خان صاحب)

اس قول کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ متقین جس طرح مسلمانوں کے سامنے اظہار ایمان کرتے ہیں بعینہ اسی طرح مسلمانوں سے غیوبت کی حالت میں بھی مؤمن ہی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ کچھ یوں ہوگا کہ " جو ایمان رکھتے ہیں (مسلمانوں سے) غائب ہونے کی حالت میں بھی"۔ یہ قول ابو مسلم اصفہانی کا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ " بالغیب"، ترکیب میں اگرچہ "حال"، ہی واقع ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غائب ہونے کے باوجود ایمان رکھتے ہیں۔ اس صورت میں صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کے علاوہ باقی افرادِ امت ہی اس آیت کا مصداق قرار پائیں گے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اس آیت میں " الغیب" سے مراد قلب اور دل ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ " جو دل سے ایمان لاتے ہیں"۔ [1]

ثانیاً: یہ بات مدِّ نظر رہنی چاہیئے کہ پہلا قول جس کے مطابق حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے وہی جمہور مفسرین کے نزدیک راجح و مختار ہے۔ اسی بنا پر اس تفسیر کو مفسرین دیگر اقوال سے مقدم ذکر فرماتے ہیں[2] نیز امام رازی رحمہ اللہ نے ابو مسلم اصفہانی کے قول کی تردید فرما کر پہلے قول کو ہی ترجیح دی ہے[3]۔

بہرحال ثابت ہوگیا کہ احمد رضا خان صاحب بریلوی نے جمہور مفسرین اور سوادِ اعظم کی تفسیر کے خلاف ترجمہ کیا ہے۔

ثالثاً: یہ قول جس کے مطابق شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہ ترجمہ فرمایا ہے نہ صرف امت کے عام جمہور مفسرین کا مختار اور پسندیدہ ہے بلکہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے بھی یہی تفسیر منقول ہے چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس، ابو العالیہ، قتادہ، ربیع بن انس وغیرہ

---

[1] یہ چاروں قول ان تفاسیر میں مذکور ہیں۔ بیضاوی شریف ص ۱۸، ۱۹ وحاشیہ الشہاب علی البیضاوی ص ۲۱۶/ج۱ شیخ زادہ علی البیضاوی ص ۸۹/ج۱ و روح المعانی ص ۱۱۵/ج۱ و روح البیان ص ۳۲/ج۱ و ابو السعود علی ہامش الکبیر ص ۴۳/ج۱ وغیرہ)

[2] مثلاً ملاحظہ ہو ابو السعود علی ہامش الکبیر ص ۴۳/ج۱، روح البیان ص ۳۲/ج۱، روح المعانی ص ۱۱۵/ج۱، بیضاوی شریف ص ۱۸ وغیرہ۔

[3] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص ۱۶۹/ج۱۔

رضی اللہ عنہم سے "الغیب" کی تفسیر میں یہی منقول ہے کہ اس سے مراد اس مقام پر وہ امور ہیں جو ہماری نظروں سے اوجھل اور غائب ہیں لیکن مسلمان ہونے کے لیے ان پر ایمان لانا ضروری ہے مثلاً جنت، جہنم، بعث بعد الموت، یوم قیامت، فرشتے نیز اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نبوت ورسالت وغیرہ تمام غیر مرئی امور جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس مقام پر لفظ "غیب" سے مراد ہیں[1]۔

لہٰذا ثابت ہوگیا کہ احمد رضا خان صاحب نے نہ صرف یہ کہ جمہور مفسرین کی تفسیر کے خلاف ترجمہ کیا ہے بلکہ صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منقول تفسیر سے بھی عدول کیا ہے۔

رابعاً: صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اور دیگر جمہور مفسرین کی تفسیر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن پاک میں ایک دو بار نہیں بلکہ بیسیوں بار "ایمان" کے مشتقات کے صلہ میں "با" کا استعمال ہوا ہے اور سب ہی جگہ "با" اس پر داخل ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر بھی "غیب" سے مراد وہ امور غیبیہ ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان سب باتوں سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جمہور مفسرین ہی کی تفسیر زیادہ صحیح اور رائج ہے۔ اسی کے مطابق حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے۔

خامساً: احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ابومسلم اصفہانی کے قول کے مطابق ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ترجمہ ابومسلم کے قول کے مطابق بھی درست

[1] ملاحظہ ہو تفسیر طبری ص۸۷/۱، تفسیر در منثور ص۲۵/۱، فتح القدیر للشوکانی ص۲۳/۱ وغیرہ

نہیں ہے کیونکہ ابومسلم کا مقصد تو یہ ہے کہ یہ متقین جس طرح مسلمانوں کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں ایسے ہی ان سے غائب اور دور ہونے کی صورت میں بھی مؤمن ہی ہوتے ہیں جب کہ احمد رضا خان صاحب کا مقصد یہ ہے کہ وہ "بن دیکھے ایمان لاتے ہیں"۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ خان صاحب کا ترجمہ جیسے جمہور مفسرین کے خلاف ہے ایسے ہی ابومسلم اصفہانی کے قول کے بھی مخالف ہے اور خان صاحب کے ترجمہ کا تیسرے اور چوتھے قول کے مطابق نہ ہونا تو ویسے ہی اظہر من الشمس ہے لہٰذا خان صاحب کا ترجمہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اور جمہور مفسرین کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اجماع امت کے بھی خلاف ہے۔ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اور جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی "جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا"۔

سادساً: جملہ "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" کا ترجمہ "ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں" قطعاً درست نہیں ہے اسے زیادہ سے زیادہ ہم ترجمانی قرار دے سکتے ہیں لیکن ترجمہ کرتے وقت بلاضرورت ترجمانی شروع کردینا کوئی مستحسن بات نہیں بلکہ ترجمہ کو معیوب کرنا ہے۔ معمولی عربی جاننے والا شخص بھی جانتا ہے کہ "مَا رَزَقْنٰهُمْ" کا صحیح ترجمہ وہ ہوگا جس میں ضمیر فاعل (نَا) اور ضمیر مفعول (هم) اور اسم موصول (ما) کا ترجمہ نمایاں ہو۔ ایسا مکمل اور بالکل صحیح ترجمہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا ہے یعنی "اور جو ہم نے روزی دی ہے ان کو، اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

سابعاً: " انفاق" کے معنی خرچ کرنے کے ہوتے ہیں جب کہ احمد رضا خان صاحب اس کا ترجمہ " اٹھانا" سے کر رہے ہیں حالانکہ اردو میں لفظ " اٹھانا" کے بہت سے معنی آتے ہیں چنانچہ " فیروز اللغات" میں اس کے چونتیس معنی لکھے ہیں اور " فرہنگ آصفیہ" میں اس کے متعدد معانی میں سے ایک معنی یہ بھی لکھے ہیں۔ " کسی پیر یا دیوی" دیوتا کے نام کا کچھ نکالنا"۔ [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ " اٹھانا" ہندوؤں میں اپنے بتوں کے لیے مال نکالنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے اس قدر متنوع معانی میں استعمال ہونے والے لفظ کو اس مقام پر " انفاق" کے ترجمہ میں استعمال کرنا قطعاً مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا خصوصاً جب کہ یہ لفظ غیر اللہ کے نام پر دیئے جانے والے چڑھاوؤں پر بھی بولا جاتا ہے

ثامناً: لفظ " اٹھانا" اردو میں مخصوص سیاق و سباق میں تو خرچ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ویسے نہیں۔ اس مقام پر اس کے معنی وہی بنتے ہیں جو " فرہنگ آصفیہ" سے ابھی نقل کئے گئے ہیں یعنی " کسی کے نام کا کچھ نکالنا"، کسی کے نام کا کچھ نکالنے اور کسی کے نام پر خرچ کرنے میں جو فرق ہے وہ معمولی سی توجہ سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی نیت مال کو مصرف میں خرچ کرتے وقت کر لی جائے یا اپنے مال میں سے مال زکوٰۃ کو نکالتے وقت یعنی علیحدہ کرتے وقت کر لی جائے۔ دونوں صورتوں میں فرض نیت ادا ہو جائے گا۔ حالانکہ آیت مبارکہ میں خرچ کرنا مراد ہے محض نکالنا یعنی علیحدہ کرنا مراد نہیں خلاصۃ

---

[1] ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ ص 112/1 مطبوعہ مکتبہ حسن سہیل لاہور

کلام یہ ہے کہ احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ میں تین نقص ہیں پہلا یہ کہ انہوں نے بلا قرینہ واضحہ ایک ایسے لفظ کو " انفاق" کے ترجمہ میں استعمال کیا جو بہت سے معانی میں مشترک ہے۔ دوسرا یہ کہ ایسا لفظ استعمال کیا جسے ہندو بھی اپنے بتوں کے لیے مال نکالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تیسرا یہ کہ ایسا لفظ ترجمہ میں استعمال کیا جس کا مطلب اس مقام پر " نکالنا" بنتا ہے جب کہ مراد خداوندی " خرچ کرنا" ہے۔

ان نقائص اور خرابیوں سے منزہ ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی " اور جو ہم نے روزی دی ہے انکو اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

آیت (۴) وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ؀

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت شریفہ کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے۔

" اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں"۔

یہ ترجمہ بھی متعدد وجوہ سے محل نظر ہے۔

اولاً: جمہور مفسرین کے نزدیک اس آیت کے مصداق وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے ہیں۔ خواہ پہلی آیت (اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الآیۃ) سے صرف مشرکین عرب میں سے ایمان لانے والے حضرات مراد ہوں یا عام ایمان لانے والے لوگ مراد ہوں۔ اس آیت سے تخصیص بعد التعمیم کے طور پر صرف مؤمنین اہل کتاب مراد لے

لیے جائیں۔ بہرحال جمہور مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مصداق مؤمنین اہل کتاب ہی ہیں۔ اور یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔[۱]

چونکہ یہ تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اس لیے جمہور مفسرین نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ اگر دوسری تفسیر ذکر بھی کی ہے تو اسے دوسرے نمبر پر بطور ایک احتمال کے ذکر کر دیا ہے۔[۲]

اس بنا، پر چاہیئے تھا کہ دونوں آیتوں میں آنے والے لفظ "یُؤْمِنُوْنَ" کے ترجمہ میں کچھ ایسا فرق ہوتا جو دونوں آیتوں کے مصداق میں پائے جانیوالے فرق کی طرف اشارہ کر دیتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ احمد رضا خان صاحب نے دونوں مقام پر ترجمہ بالکل یکساں کیا ہے یعنی دونوں جگہ لفظ "یُؤْمِنُوْنَ" کا ترجمہ "ایمان لائیں" کیا ہے جب کہ اس لطیف فرق کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ نے ملحوظ رکھا ہے چنانچہ انہوں نے پہلی آیت میں "یُؤْمِنُوْنَ"

---

[۱] ملاحظہ ہو تفسیر طبری ص ۹۷ ج ۱۔

[۲] مثلاً ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی درسی ص ۲ وحاشیہ الشہاب علی البیضاوی ص ۲۳۱ ج ۱ وشیخ زادہ علی البیضاوی ص ۹۵ ج ۱ وتفسیر طبری ص ۲۰ ج ۱ ومراح لبید ص ۴ ج ۱ الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز علی ہامش مراح لبید ص ۴ ج ۱ وجمل ص ۱۳ ج ۱ وتفسیر البغوی علی ہامش الخازن ص ۳۱ ج ۱ وابو السعود علی ہامش الکبیر ص ۴ ج ۱ وتفسیر الکبیر مع ابی السعود ص ۱۶۸ ج ۱ وتفسیر نسفی ص ۱۴ ج ۱ وتفسیر قرطبی ص ۱۸۰ ج ۱ وروح البیان ص ۴ ج ۱ وتفسیر نیشاپوری علی ہامش الطبری ص ۱۳۶ ج ۱ وکشاف ص ۱۳۴ ج ۱ وروح المعانی ص ۱۲۱ ج ۱ وغیرہ۔ اور متعدد مفسرین نے اس تفسیر کو کہ اس آیت کا مصداق مؤمنین اہل کتاب ہیں، درایۃً بھی راجح قرار دیا ہے مثلاً ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی درسی ص ۲ حاشیہ ۴ والشہاب علی البیضاوی ص ۲۳۱ ج ۱ اور روح المعانی ص ۱۲۱ ج ۱ وغیرہ

کا ترجمہ بصیغۂ حال "یقین کرتے ہیں" کیا ہے جب کہ دوسری آیت میں "یُؤْمِنُوْنَ" کا ترجمہ بصیغۂ ماضی "ایمان لائے" کیا ہے۔ کیونکہ اہل کتاب کا ایمان لانا ایک اعتبار سے مشرکین کے ایمان لانے سے مقدم ہے اس لیے کہ وہ سابقہ آسمانی کتابوں ـــــــ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی پیشگوئیاں مذکور ہیں ـــــــ پر ایمان لانے کے باعث مشرکین سے باعتبار ایمان مقدم ہیں بہرحال احمد رضا خان صاحب کا ذہنِ نارسا اس باریک فرق تک نہ پہنچ سکا باوجودیکہ کئی مقامات پر موصوف نے مضارع کا ترجمہ ماضی سے کیا ہے مثلاً آیت "قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَاءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ الآیۃ" البقرہ ۲: ۹۱ کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہے۔ "تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا"۔ لیکن اس مقام پر خان صاحب نقطۂ حقیقت کو نہ پا سکے۔

ثانیاً: لفظ "اے محبوب" ترجمہ میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے کیونکہ قرآن پاک میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ "اے محبوب" ہو۔ ہاں البتہ اگر وہ اس کو بین القوسین (بریکٹ کے اندر) لکھ دیتے تو ہم بھی یہ اعتراض نہ کرتے جیسا کہ "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" کا ترجمہ "وہ بلند رتبہ کتاب" کرنے کے بعد خان صاحب بریلوی نے بریکٹ میں "قرآن" لکھ دیا ہے لیکن اس مقام پر انہوں نے اس لفظ کو ترجمہ میں اس طرح داخل کر دیا ہے کہ ناواقف انسان یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ بھی متن قرآن میں شامل کسی لفظ کا ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کاروائی کہ جس سے غیر قرآن کے قرآن ہونے کا ایہام پیدا ہوتا ہو۔ کسی طرح لائق تحسین قرار نہیں دی جا سکتی۔

ثالثاً: نیز اگر اضافہ کرنا ہی تھا تو بریکٹ میں کسی ایسے لفظ کا اضافہ زیادہ مناسب ہوتا جس سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کو عام طور پر قرآن پاک میں خطاب فرمایا ہے مثلاً "یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ"،
(اے رسول!) "یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ" (اے نبی!) وغیرہ۔ اس کے برعکس
"اے محبوب!" کے لفظ سے پورے قرآن پاک میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ
نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب نہیں فرمایا ہے۔

رابعاً: اصول فقہ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ مسئلہ درج ہے
کہ لفظ "ما" عموم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر بھی عموم
ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو "اِملاءُ مَا مَنَّ بِهِ الرَّحْمٰن"
ص ۱۳ کیونکہ کسی پیغمبر پر نازل شدہ جمیع امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر
ان میں سے کسی ایک بات کا بھی کوئی شخص انکار کر دے تو وہ شخص قطعاً
مسلمان نہیں رہے گا لیکن احمد رضا خان صاحب نے لفظ "ما" کا جو
ترجمہ پیش کیا ہے یعنی لفظ "جو" وہ عموم میں واضح نہیں ہے کیونکہ اگر
کوئی شخص پیغمبر پر نازل ہونے والی باتوں میں سے بعض باتوں پر ایمان لائے
اور بعض پر ایمان نہ لائے تو ایسے شخص کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے
کہ یہ شخص اس پر ایمان لایا ہے جو پیغمبر پر نازل ہوا ہے۔ بہرحال یہ بات
واضح ہو گئی کہ "ما" کا ترجمہ جو خان صاحب نے کیا ہے وہ عموم میں
بالکل واضح نہیں ہے۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے
اپنے ترجمہ میں لفظ "ما" کے عموم کو خوب اچھی طرح واضح کر دیا ہے
چنانچہ ان کا ترجمہ یہ ہے "...... جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل
ہوا تیری طرف ......" حضرت شیخ الہند نے لفظ "ما" کا ترجمہ
"جو کچھ" فرما کر عموم کو خوب واضح کر دیا ہے۔

خامساً: وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ کے ترجمہ میں احمد رضا

خان صاحب نے لفظ "هُمْ" کا ترجمہ کیا ہی نہیں ہے جب کہ حضرت
شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمہ میں یہ خامی نہیں ہے۔ وہ ترجمہ فرماتے ہیں۔
"اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں۔" اس میں لفظ "وہ" هُمْ ہی کا
ترجمہ ہے۔ بہرحال اس آیت کا بالکل صحیح اور فصیح ترجمہ وہ ہے جو حضرت
شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔
"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف
اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ
یقینی جانتے ہیں۔"

آیت (۵) اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت کریمہ کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے
"وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی
مراد کو پہنچنے والے۔"
اس ترجمہ میں بھی کئی سقم ہیں۔

اولاً: احمد رضا خان صاحب لفظ "رب" کا ترجمہ ترک کر گئے ہیں

ثانیاً: الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بلا ضرورت نظر انداز کر
دیا ہے چنانچہ "عَلٰی هُدًی" کا ترجمہ پیچھے اور "مِّنْ رَّبِّهِمْ" کا ترجمہ
پہلے کر دیا ہے۔

ثالثاً: "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" ایک
مستقل علیحدہ جملہ ہے لیکن خان صاحب بریلوی اس کے اردو ترجمہ میں
حرف ربط "ہیں" ترک کر گئے ہیں جس کے باعث اس کی استقلالی حیثیت

دب کر رہ گئی ہے ۔ ان تمام نقائص سے پاک اور مُبَرّا ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی

"وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے"۔

آیت (۶) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے ۔

"بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں"۔

یہ ترجمہ بھی متعدد وجوہ سے محل نظر ہے ۔

اولاً : "اَلَّذِیْنَ" اسم موصول ہے جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن خان صاحب بریلوی نے ترجمہ میں اس کا خیال نہیں رکھا ۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ "جو لوگ" کر کے یہ بات واضح کر دی کہ یہ لفظ ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

ثانیاً : اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کا ترجمہ "جن کی قسمت میں کفر ہے" غلط ہے ۔ کیونکہ یہاں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ "قسمت میں" ہو۔

ثالثاً : "اَلَّذِیْنَ" کا صلہ "کَفَرُوْا" جملہ فعلیہ ہے جب کہ احمد رضا خان صاحب نے بلاوجہ اس کا ترجمہ جملہ اسمیہ والا کیا ہے ۔ ان دونوں نقائص سے مبرّا اور پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت

شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی "بے شک جو لوگ کافر ہو چکے"

رابعاً : اگر یہ کہا جائے کہ اس مقام پر احمد رضا خان صاحب نے مندرجہ بالا جملہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ مرادِ خداوندی کی ترجمانی کی ہے تو جواباً عرض ہے کہ اگر یہ ترجمہ ہے تو اس کا غلط ہونا واضح ہو گیا ہے اور اگر یہ ترجمانی ہے تو بھی غلط ہے کیونکہ کسی شخص کی قسمت میں کفر ہونے کی دو صورتیں ہیں پہلی یہ کہ قسمت میں لکھا ہو کہ یہ شخص پہلے کفر کرے گا بعد ازاں ایمان لے آئے گا ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قسمت میں صرف کفر کرنا ہی لکھا ہو اور ایمان لانا اس کی قسمت میں بالکل نہ ہو ۔ اور ظاہر ہے کہ اس آیت میں وہ لوگ تو قطعاً مراد نہیں ہیں جن کی قسمت میں کفر کے ساتھ ساتھ ایمان لانا بھی لکھا ہوا ہے بلکہ وہی لوگ مراد ہیں جن کی قسمت میں صرف کفر ہی لکھا ہے اور ایمان لانا ان کی قسمت میں سرے سے ہے ہی نہیں ۔

اب دیکھئے کہ خان صاحب بریلوی کی اس ترجمانی سے لازم آتا ہے کہ جس شخص نے ایک بار بھی کفر کر لیا وہ کبھی بھی ایمان نہ لائے ۔ کیونکہ اس شخص سے کفر کے صدور نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی "قسمت میں کفر ہے" اور آیت مبارکہ کی ترجمانی خان صاحب نے یہ کی ہے کہ "جن کی قسمت میں کفر ہے وہ ایمان لانے کے نہیں"۔

لہٰذا ثابت ہو گیا کہ خان صاحب کی ترجمانی سے لازم آتا ہے کہ جس شخص نے ایک بار کفر کر لیا وہ پھر کبھی ایمان نہیں لائے گا ۔ حالانکہ لاکھوں کفار کا ایمان لانا ایک بین حقیقت ہے اس لیے ترجمانی کی صحیح صورت یہ تھی کہ وہ یوں کہتے کہ "جن کی قسمت میں صرف کفر ہے" یا یوں لکھتے کہ "جن کی قسمت میں کفر ہی ہے"۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ احمد رضا خان

صاحب کا بیان کردہ مطلب اگر ترجمہ ہے تو بھی غلط اور اگر ترجمانی ہے تو بھی غلط۔

خامساً: خان صاحب بریلوی نے واحد مذکر کا ترجمہ جمع مذکر حاضر سے کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ادب کے لیے یہ تغیر کیا ہے تو عرض ہے کہ ادب کے لیے لفظ "آپ" استعمال کیا جا سکتا تھا کیونکہ لفظ "آپ" میں بہ نسبت لفظ "تم" زیادہ ادب پایا جاتا ہے۔

آیت (۷) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی، اور ان کی آنکھوں پر گھٹاٹوپ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب"۔

اس ترجمہ میں بھی متعدد خامیاں ہیں۔

اولاً: "خَتَمَ" کا لفظ جو آیت میں سب سے پہلے ہے، احمد رضا خان صاحب نے بلا ضرورت اس کو ترجمہ میں سب سے پیچھے کر دیا اور اس طرح الفاظ کی قرآنی ترتیب کو بلا وجہ نظر انداز کر دیا۔

ثانیاً: "وَعَلٰى سَمْعِهِمْ" میں جو ضمیر "مضاف الیہ" واقع ہو رہی ہے، اس کا ترجمہ خان صاحب نے نہیں کیا۔ ان دونوں عیبوں سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے یعنی "مُہر کر دی اللہ نے ان کے دِلوں پر اور ان کے کانوں پر"۔

ثالثاً: "وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" ایک مکمل جملہ ہے لیکن احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ میں چونکہ حرف ربط "ہے" نہیں

ہے۔ اس لیے رضا خانی ترجمہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ نیز اس ترجمہ سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ "ان کے لیے بڑا عذاب" ہے یا نہیں ہے کیونکہ موصوف نے صرف یہ کہہ کر بس کر دیا ہے کہ "اور ان کے لیے بڑا عذاب" اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو "اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے"

رابعاً: "غِشَاوَةٌ" کا ترجمہ خان صاحب بریلوی نے "گھٹاٹوپ" کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی غلط ہے۔ اس غلطی کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

اول یہ کہ مفسرین نے دِلوں اور کانوں کے لیے لفظ "ختم" (مہر لگانا) اور آنکھوں کے لیے لفظ "غِشَاوَة" (پردہ) استعمال کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ دل اور کان کا علم و ادراک کسی ایک جہت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ آواز خواہ آگے سے آئے یا پیچھے سے دائیں سے یا بائیں سے، اوپر سے یا نیچے سے، کان بہرحال اس کا ادراک کر لیں گے یہی حال قلب کے ادراک کا ہے کہ اس کے علم و ادراک کے لیے کوئی بھی جہت متعین نہیں ہے بلکہ ہر جہت کی چیز کا ادراک کر لیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دِلوں اور کانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کے دِلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی ہے کیونکہ مہر اُسی وقت لگائی جاتی ہے جب کسی چیز کو ہر طرف سے اچھی طرح بند کر لیا جائے اور کسی طرف سے بھی کوئی سوراخ کسی چیز کے نکالنے یا داخل کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔ اس مُہر لگانے کو عام طور پر سیل کرنا کہا جاتا ہے لیکن دل اور کان کے برعکس آنکھ کے ادراک کے لیے ایک جہت متعین ہے کہ وہ اپنے سامنے والی چیزوں

کا ہی ادراک کر سکتی ہے اور جو چیز سامنے کی جہت میں نہ ہو آنکھ اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس لیے آنکھوں کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ اُن پر پردہ ہے۔ بالفاظ دیگر دِل اور کان کو اپنے فعل سے روکنے کے لیے ضرورت تھی کہ ان کو ہر طرف سے بند کر دیا جائے اس لیے انہیں سِیل بند کر کے اُن پر مُہر لگائی گئی اور آنکھ چونکہ صرف ایک ہی جہت میں ادراک کرتی ہے اس لیے اس کی خاطر وہ چیز استعمال کی گئی جو اُسی ایک جہت میں آنکھ کے عمل کو بند کر دے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ "غِشَاوَۃ" (پردہ) صرف ایک ہی جہت میں رکاوٹ بنتا ہے نہ کہ کئی جہات میں۔

دوسری یہ کہ "گھٹاٹوپ" لغت میں متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جو معنی اس مقام سے قدرے مناسبت رکھتے ہیں وہ یہ ہیں۔ "پالکی، پینس یا گھوڑا گاڑی کا غلاف جو کہ دو غبار اور بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے ڈالتے ہیں" فیروز اللغات۔ گویا "گھٹاٹوپ" صرف ایک ہی جہت کی حفاظت کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اوپر کی جہت کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں اور آگے پیچھے کی پانچ جہات کی حفاظت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ان دونوں باتوں کے سمجھ لینے کے بعد یہ بات آپ پر خود بخود واضح ہو گئی کہ لفظ "غِشَاوَۃٌ" کا ترجمہ "گھٹاٹوپ" سے کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ "غِشَاوَۃ" سے مراد اس مقام پر بقول مفسرینِ عظام وہ چیز ہے جو صرف ایک جہت میں روک کا کام دے، جبکہ "گھٹاٹوپ" متعدد جہات میں اپنا کام کرتا ہے۔ اس لیے اس کا صحیح ترجمہ "پردہ" ہے۔ مندرجہ بالا نقائص سے پاک اور منزہ ترجمہ اس آیت کا وہ ہے جو حضرت شیخ الہند

رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی۔

"مُہر کر دی اللہ نے ان کے دِلوں پر اور ان کے کانوں پر" اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

آیت (۸) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

خان صاحب بریلوی نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں"۔

اس ترجمہ میں متعدد خامیاں ہیں۔

اوّلاً: اسم موصول "مَنْ" کا ترجمہ خان صاحب چھوڑ گئے ہیں جبکہ "مِنْ" تبعیضیہ اور "مَنْ" موصولہ دونوں کے ترجمہ کو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے بڑی خوش اسلوبی سے جمع فرما دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں"۔

اس میں "کچھ" "مِنْ" تبعیضیہ کا ترجمہ ہے اور "جو" "مَنْ" موصولہ کا۔

ثانیاً: آیت شریفہ میں اسم جلالہ "اللہ" اور لفظ "اَلْيَوْمِ الْاٰخِرِ" دونوں کے ساتھ حرف جر "ب" علیحدہ علیحدہ موجود ہے لیکن احمد رضا خان صاحب نے صرف ایک "ب" کا ترجمہ کیا ہے اور دوسری "ب" کا ترجمہ ان سے چھوٹ گیا ہے۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ

نے حرف جر " ب " کی تکرار کی رعایت فرماتے ہوئے دونوں کا ترجمہ بھی علیحدہ علیحدہ فرمایا ہے ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

" ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر "۔

اس میں لفظ " پر " کی تکرار اسی لیے کی گئی ہے کہ قرآن پاک میں حرف " ب " مکرر آیا ہے۔

ثالثاً : رضاخانی حضرات نے شور مچا رکھا ہے کہ عام ترجمہ نگار حضرات لفظی ترجمہ کرتے ہیں جس کے باعث اصل معنی و مراد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں بلکہ بسا اوقات روحِ اسلام سے بالکل متصادم معنی پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے، یہ تو الگ مسئلہ ہے ۔ ہم تو اس وقت صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ " اَلْیَوْمِ الْاٰخِرِ " کا کس نے لفظی ترجمہ کیا ہے ؟ اور کس نے معنی مراد کو واضح کر دیا ہے کیونکہ " دن قیامت " سے جس قدر معنی واضح ہو جاتے ہیں " پچھلے دن " سے واضح نہیں ہوتے ۔ بلکہ احمد رضا خان صاحب نے لفظی ترجمہ کے شوق میں یہ بھی نہ دیکھا کہ کہیں کوئی شخص " پچھلے دن " سے گزشتہ دن یا شام کا وقت ہی نہ سمجھ بیٹھے جن کا مرادِ خداوندی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے ۔ اس کے برعکس شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ اس اجمال و ابہام سے بالکل پاک ہے۔

رابعاً : اللہ تعالیٰ کے قول " وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ " کے بارے میں علامہ بیضاوی فرماتے ہیں۔

وكان اصله وما آمنوا ليطابق قولهم

اور اس کی اصل " وَمَا اٰمَنُوْا " تھی تاکہ ان کے قول

فى التصريح بشان الفعل دون الفاعل لكنه عكس تاكيدًا ومبالغة" فى تكذيب لان اخراج ذواتهم من عداد المؤمنين ابلغ من نفى الايمان عنهم فى ماضى الزمان ولذلك اكد النفى بالباء

(تفسیر بیضاوی درسی ص۲۷)

(اٰمَنَّا الایۃ) کے مطابق ہو جاتا ۔ شانِ فعل کی تصریح کرنے میں بجائے فاعل کے ۔ لیکن تکذیب میں مبالغہ اور تاکید پیدا کرنے کی خاطر اس کا عکس کر دیا گیا ہے اس لیے کہ منافقین کی ذوات کو مومنین کی فہرست سے خارج کر دینا زیادہ بلیغ ہے ان سے زمانۂ ماضی میں ایمان کی نفی کرنے کی بہ نسبت اور اسی لیے نفی کو بار کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جملہ فعلیہ " وَمَا اٰمَنُوْا " کی بجائے جملہ اسمیہ " وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ " لانے کی وجہ ان منافقین کی تکذیب میں تاکید اور مبالغہ پیدا کرنا ہے ۔ نیز لفظ " بِمُؤْمِنِيْنَ " میں " ب " کا استعمال بھی اسی تاکید کے لیے ہے ۔ لیکن خان صاحب بریلوی اس جملہ کے تمام تاکیدی لغات سے بے خبر ہو کر ترجمہ کر رہے ہیں۔

" اور وہ ایمان والے نہیں "

خان صاحب کے ترجمہ کے برعکس اس آیت میں منافقین سے ایمان

کی نفی کرنے میں جس تاکید کا اہتمام کیا گیا ہے اس کو پوری طرح مدِّ نظر رکھتے ہوئے حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے ترجمہ فرمایا ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اور وہ ہرگز مؤمن نہیں"۔

بہر حال ثابت ہو گیا کہ آیت بالا کا رضاخانی ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے اور ان تمام مذکورہ نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مؤمن نہیں"۔

آیت (۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو۔ اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو۔ اور انہیں شعور نہیں"

اس ترجمہ میں متعدد وجوہ سے سقم پایا جاتا ہے۔

اولاً: خان صاحب کے اس ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے اب تک فریب دہی کا کوئی عمل نہیں کیا ہے البتہ مستقبل قریب میں بہت جلد کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ "آٹھ بجا چاہتے ہیں" یعنی تاحال آٹھ نہیں بجے ہیں لیکن جلد ہی بجنے والے ہیں۔ بالکل اسی طرح منافقین کے بارے میں احمد رضا خان صاحب کہہ رہے ہیں کہ "فریب دیا چاہتے ہیں"، جس کا صاف مطلب یہ بنتا ہے کہ منافقین سے فریب

دہی کا کوئی عمل تاحال صادر ہی نہیں ہوا ہے اگرچہ جلد ہی وہ یہ عمل کیا چاہتے ہیں۔ یہ مطلب بالکل غلط ہے کیونکہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منافقین کی منافقانہ کرتوتوں کو ہی فریب دہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ثانیاً: خان صاحب کے ترجمہ "فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو" سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ایمان والے بہت جلد منافقین کی فریب دہی کا شکار ہونے والے ہیں، صرف چند لمحات کی دیر ہے۔ العیاذ باللہ۔

اس مفہوم کے صریح طور پر غلط ہونے میں کیا شبہ ہے۔

ثالثاً: اس آیت میں وارد ہونے والے لفظ "اَنْفُس" کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازیؒ رقمطراز ہیں۔

النفس ذات الشئ وحقیقتہ (تفسیر کبیر ص ۶۳ ج ۲) — "نفس" شئی کی ذات اور اس کی حقیقت ہے۔

نیز صاحب "مدارک" لفظ "اَنْفُس" کی مراد بتلاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

والمراد بالانفس ھھنا ذواتھم۔ (مدارک التنزیل ص ۱۴) — یہاں پر "اَنْفُس" سے خود ان (منافقین) کی اپنی ذوات مراد ہیں۔

اور صاحب "اکلیل" اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لانھا اصل معناھا ولا مقتضی — کیونکہ یہ "نفس" کے حقیقی معنی ہیں اور اس سے عدول

للعدول عنہا۔ کرنے کا کوئی مقتضی اور سبب

(اکلیل علی مدارک التنزیل ص۶ ج۱) موجود نہیں ہے۔

اس مقام پر "النفس" سے خود ان کی اپنی ذات مراد ہونے کی تصریح دیگر متعدد تفاسیر میں بھی موجود ہے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "نفس" کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ذات، روح طبی (شرائین میں موجود وہ بخار لطیف جو قوت حیاۃ و حس و حرکت کا حامل ہوتا ہے اور اطبار اس کی تین قسمیں کرتے ہیں ۱ روح حیوانی ۲ روح نفسانی ۳ روح طبعی) روح بمعنی جان، قلب، خون وغیرہ ملاحظہ ہو بیضاوی شریف ص۲۸ وغیرہ ان متعدد معانی میں سے "ذات" والے معنی حقیقی ہیں باقی مجازی۔

جمہور مفسرین کی تصریح کے مطابق اس مقام پر "نفس" کے حقیقی معنی "ذات" مراد ہیں۔ جن بعض مفسرین نے "ذات" کے علاوہ دیگر مجازی معانی کا احتمال ذکر کیا ہے انہوں نے بھی ترجیح حقیقی معنی ہی کو دی ہے

اب دیکھئے کہ احمد رضا خان صاحب نے جمہور مفسرین کے بیان کردہ راجح معنی کو ترک کر کے ایک مرجوح معنی "جان" کو ذکر کر دیا ہے جس کے معنی "روح" کے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو"

اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے جمہور مفسرین کے بیان کردہ معنی کو اختیار فرماتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے یعنی

---

[1] مثلاً روح البیان ص۵۳ ج۱ و روح المعانی ص۱۴۸ ج۱ و کشاف ص۱۷۵ ج۱ و تفسیر نیشاپوری ص۵۵ ج۱ وغیرہ

"اور در اصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو"

<u>رابعًا</u>: عربی زبان کا ابتدائی طالب بھی جانتا ہے کہ "مَا یَشْعُرُوْنَ" مضارع منفی کا صیغہ ہے اور ترکیب کے لحاظ سے یہ "جملہ فعلیہ" ہے لیکن احمد رضا خان صاحب اس کا ترجمہ "جملہ اسمیہ" والا کر رہے ہیں یعنی "انہیں شعور نہیں" جو قرآنی لفظ "مَا یَشْعُرُوْنَ" کی بجائے "مَا لَهُمْ شُعُوْرٌ" ایسے جملہ کا ترجمہ ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب فرمائیں کہ اس مقام پر احمد رضا خان صاحب نے لفظی ترجمہ کی بجائے مرادِ خداوندی کی ترجمانی کی ہے اس لیے جوابًا عرض ہے کہ اگر اسے ترجمہ قرار دیا جائے تو اس کا غلط ہونا تو واضح ہی ہے اور اگر اسے ترجمانی قرار دیا جائے تو پھر بھی غلط ہے کیونکہ "ترجمانی" کہا جاتا ہے مرادِ خداوندی اپنے الفاظ میں ادا کرنے کو۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ نہیں ہے کہ منافقین کو شعور بھی حاصل نہیں ہے ورنہ پھر منافقین "مکلفین" کے زمرہ سے نکل کر غیر مکلف قرار پا جائیں گے۔ اس لیے کہ مکلف ہونے کا مدار "عقل" پر ہے اور جس کو "عقل" چھوڑ "شعور" یعنی حواس خمسہ ظاہرہ کے ذریعہ علم حاصل ہونے کی قوت بھی حاصل نہیں، وہ کیونکر مکلف قرار پا سکتا ہے۔ لہٰذا احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کو مرادِ خداوندی کی "ترجمانی" بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مرادِ خداوندی بھی اسی ترجمہ سے زیادہ واضح ہوتی ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ ان منافقین کو "شعور" تو درکنار "عقل" تک حاصل ہے لیکن یہ لوگ اپنی حد سے زیادہ غفلت اور لاپروائی کے باعث بالکل بدیہی امور کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو اپنی شدتِ بداہت کے باعث گویا حواس سے بھی معلوم

ہو سکتے تھے، اس لیے حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ نہ صرف یہ کہ الفاظ قرآنی کا بالکل صحیح ترجمہ ہے بلکہ مرادِ خداوندی کی مکمل ترجمانی بھی ہے۔ بہرحال یہ تمام نقائص جو احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ میں پائے جاتے ہیں، ان سب سے منزہ اور پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔

"دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں سوچتے۔"

آیت (۱۰) فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بدلہ جھوٹ کا۔"

خان صاحب کے اس ترجمہ میں کئی لحاظ سے سقم ہے۔

اولاً: خان صاحب نے لفظ "فَزَادَهُمُ اللّٰهُ" کے شروع میں آنے والے حرف کا ترجمہ "تو" کیا ہے جو اردو میں "حرفِ جزاء" ہے چنانچہ "فرہنگِ آصفیہ" میں ہے۔

"یہ لفظ بواوِ مجہول کبھی تائے فوقانی مفتوح کبھی تائے مثناۃ مضموم کے ساتھ بولنے میں آتا ہے اور جزاء شرط کے علاوہ تحسین کلام و تاکید کے موقع پر بھی مستعمل ہے جیسے "واہ تم تو

خوب آئے" دیکھو تو، سنو تو، ٹھہرو تو۔ کبھی زائد بھی آتا ہے جیسے میں تو آتا تھا اس نے روک لیا"۔ [1]

اس کے علاوہ ایک معنی اس لفظ کے "الحاصل" اور "حاصل کلام" بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان معانی میں سے کوئی معنی بھی اس مقام پر چسپاں نہیں ہوتے ان معانی کے علاوہ جتنے معانی اس لفظ کے ذکر کئے گئے ہیں ان سے "جزاء" کا مفہوم ہی زیادہ نمایاں ہوتا ہے مثلاً تب، پس، اس وقت، اس حالت میں اور ظاہر ہے کہ اس مقام پر "جزا" کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ اس لیے اس مقام پر "ف" کا زیادہ مناسب ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی "پھر" کیونکہ عربی زبان میں "ف" کا اصل معنی "تعقیب" یعنی کسی کے بعد ہونا ہے اور اردو زبان میں یہی معنی لفظ "پھر" کے ہیں چنانچہ اردو لغات میں "پھر" کے معنی لکھے ہیں۔ "دوبارہ، بعد ازاں پس ازیں، اس کے بعد" وغیرہ۔ اور چونکہ "جزاء" بھی "شرط" کے بعد ہوتی ہے اس لیے اردو میں مجازاً لفظ "پھر" کو "حرفِ جزا" کے طور پر بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس مقام پر "ف" کے رضاخانی ترجمہ کے مقابلہ میں شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ زیادہ مناسب اور فصیح ہے۔

ثانیاً: اردو کی صحت کے ساتھ ساتھ قرآنی الفاظ کی ترتیب کو جس طرح حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے ملحوظ نظر رکھا ہے، اس طرح احمد رضا خان صاحب الفاظ کی قرآنی ترتیب کو اپنے ترجمہ میں برقرار نہ رکھ سکے مثلاً آیت مذکورہ کے جملہ "لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ" کا ترجمہ خان صاحب

[1] فرہنگ آصفیہ ص ۶۳۲ ج ۱ ۔

کرتے ہیں "ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "ان کے لیے عذاب دردناک ہے" قرآن پاک میں چونکہ لفظ "عَذَابٌ" پہلے تھا اس لیے حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ترجمہ میں بھی اس کو مقدم رکھا اور لفظ "اَلِیْمٌ" چونکہ مؤخر تھا اس لیے ترجمہ میں بھی اس کا ترجمہ بعد میں رکھا گیا۔ کیونکہ یہ قرآنی ترتیب اردو کے لحاظ سے بھی غیر فصیح نہ تھی۔

ثالثاً: "بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ" میں حرف "ب" کے بارے میں جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ "سببیت" کے لیے ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

(ولهم عذاب اليم بما كانوا يكذبون) صريح في ان كذبهم علة العذاب الاليم[1]

"وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ" اس بات میں صریح ہے کہ ان کا کذب "عذاب الیم" کی علت ہے۔

سید شریف جرجانی رحمہ اللہ تفسیر کشاف کی ایک عبارت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(قوله وفيه) اي وفي جعل عذابهم مسببا لكذبهم[2]

(صاحب کشاف کا قول وفیہ) یعنی اور ان کے عذاب کو ان کے کذب کا مسبب بنانے میں

۱۔ تفسیر کبیر ص ۶۵/ج ۲۔

۲۔ الکشاف مع الحاشیہ ص ۱۷۸/ج ۱۔

شیخ اسماعیل حقی آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

اي بسبب كذبهم المتجدد المستمر الذي هو قولهم آمنا[1]

یعنی ان کے پے بہ پے نو بہ نو کذب کے باعث، جو کہ ان کا قول "اٰمَنَّا" ہے

مشہور مفسر علامہ نیشاپوری رقمطراز ہیں۔

اي بسبب ان هذا شانهم[2]

یعنی یہ اس وجہ سے کہ یہ ان کی شان ہے الخ

البتہ بعض مفسرین مثلاً علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک احتمال کے طور پر ذکر فرمایا ہے کہ اس مقام پر "ب" "بدلیت" کے لیے بھی قرار دی جا سکتی ہے چنانچہ "حاشیہ شہاب" میں ہے۔

وقوله بسبب كذبهم اشارة الى ان الباء فيه للسببية وقوله او مبدله اشارة الى انه يجوز ان تكون للبدلية۔

(حاشیہ الشہاب علی البیضاوی ص ۳۲۳/ج ۱)

اور ان (بیضاوی) کا قول "بسبب کذبہم" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ باء اس میں سببیت کے لیے ہے اور ان کا قول "او مبدلہ" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جائز ہے کہ باء بدلیت کے لیے ہو۔

لیکن چونکہ اس پر اعتراض ہوتا تھا کہ "بدلیت"، "مبدل منہ" کے

۱۔ تفسیر روح البیان ص ۵۶/ج ۱۔

۲۔ نیشاپوری علی ہامش الطبری ص ۱۵۶/ج ۱۔

زوال کا تقاضا کرتی ہے اس لیے بعض مفسرین نے یہ رائے دی کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کے لیے مناسب تھا کہ "بدلیت" کے بجائے یہ فرماتے کہ "ب" "مقابلہ" کے لیے بھی قرار دی جاسکتی ہے[1]

یہی وجہ ہے کہ شارح بیضاوی شیخ زادہ نے اس مقام پر "بدلیت" کو مجازاً "مقابلہ" کے معنی میں لیا ہے۔[2] یہ علیحدہ بات ہے کہ محشی بیضاوی علامہ شہاب نے "مقابلہ" کے معنی کو بھی اس مقام پر غیر موزوں قرار دیا ہے۔

بہرحال ظاہر ہوگیا کہ "بدلیت" کے معنی اس مقام پر جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح نہیں ہیں لیکن احمد رضا خان صاحب اسی غیر صحیح معنی کو اپنے ترجمہ میں نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا"۔

اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق حرفِ جر "ب" کے معنی "سببیت" کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے"۔

نوٹ: "بدلیت" اور "مقابلہ" کا فرق معلوم کرنے کے لیے علم نحو کی مشہور کتاب "مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب" بحث حرفِ بار، یا علم نحو کی دیگر مبسوط کتب ملاحظہ فرمائیں۔

__رابعاً__: "بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ" میں آنے والے حرف

[1] ملاحظہ ہو حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص ۳۲۳ ج ۱۔

[2] ملاحظہ ہو شیخ زادہ علی البیضاوی ص ۱۳۷ ج ۱ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

"ما" کے بارے میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں ایک یہ کہ "ما" موصولہ ہے دوسرا یہ کہ "مَا" مصدریہ ہے۔ احمد رضا خان صاحب نے "مَا" کا ترجمہ ہی ترک کر دیا ہے۔ نہ "موصولہ" کا ترجمہ کیا ہے اور نہ ہی "مصدریہ" کا۔ کیونکہ اگر وہ "مَا" مصدریہ کا ترجمہ کرتے تو یہ لکھتے کہ "بدلہ ان کے جھوٹ بولنے کا" یا یوں کہتے کہ "بدلہ ان کے جھوٹ کہنے کا" لہٰذا واضح ہو گیا کہ احمد رضا خان صاحب لفظ "مَا" کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے "مَا" کو "موصولہ" قرار دیتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے جیسا کہ علامہ ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس مقام پر "مَا" کے موصولہ ہونے کو ترجیح دی ہے۔[1]

حضرت شیخ الہند کا ترجمہ ملاحظہ ہو

"اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے"۔

__خامساً__: "كَانُوا يَكْذِبُونَ" کے بارے میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس میں "استمرار" کے معنی پائے جاتے ہیں۔[2]

لیکن احمد رضا خان صاحب نے اس جملہ میں پائے جانے والے "استمرار" کو اپنے ترجمہ میں نظر انداز کر دیا ہے جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں "استمرار" کے مفہوم کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے کیونکہ "جھوٹ کہتے تھے"۔ اردو میں "ماضی استمراری" کا صیغہ ہے۔ بہرحال ان تمام نقائص

[1] ملاحظہ ہو بیضاوی شریف درسی حاشیہ نمبر ۵ ص ۲۹۔

[2] (ملاحظہ ہو روح البیان ص ۵۶ ج ۱ و بیضاوی درسی ص ۲۹ حاشیہ ۵ و حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص ۳۲۳ ج ۱ و شیخ زادہ ص ۱۳۷ ج ۱ و نیشاپوری علی ہامش الطبری ص ۱۵۶ ج ۱ و حاشیہ السید شریف علی الکشاف ص ۱۷۸ ج ۱ و روح المعانی ص ۱۵۱ ج ۱)

سے جو خان صاحب کے ترجمہ میں پائے جاتے ہیں، حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ منزہ اور پاک ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری اور[1] ان کے لیے عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔

آیت (۱۱) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"اور جو اُن سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔"

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اولاً: اس آیت شریفہ میں آنے والے لفظ "اِذَا" کے بارے میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر یہ "ظرف زمان" کے طور پر استعمال ہوا ہے[2] اور اردو میں لفظ "جو" ظرف زمان کے لیے استعمال ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اردو گرامر کی کتابوں میں "ظرف زمان" کے لیے "اب - جب - کب - تب

---

[1] نوٹ: ترجمہ شیخ الہند رحمہ اللہ کے تاج کمپنی کے بعض ایڈیشن جو دیکھنے میں آئے ان میں کتابت کی غلطی کے باعث لفظ "و" کا ترجمہ "اور" چھوٹ گیا ہے مثلاً ۷۵ خاص لہٰذا تصحیح کے لیے اس کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ "بجنور" ۱۳۵۴ھ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ص۲۰۰ ج۱، تفسیر البحر المحیط ص۶۱ ج۱، املاء ما من بہ الرحمٰن ص۱۸ ج۱ وغیرہ۔

ابھی - ابھی - جبھی - تبھی - کبھی کبھی - الفاظ کا ذکر کیا جاتا ہے۔[1] البتہ لفظ "جو" اردو میں اسم موصول، حرفِ شرط اور حرف مفاجات وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔[2]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احمد رضا خان صاحب کا لفظ "اِذَا" کا ترجمہ اس مقام پر "جو" سے کرنا درحقیقت لفظ "اِذَا" کے اس مقام پر "ظرفیت" کے لیے ہوتے سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ خان صاحب کے ترجمہ "جو اُن سے کہا جائے" کا مطلب بنتا ہے "اگر ان سے کہا جائے" اور ظاہر ہے کہ "اگر" اور "جب" بالفاظ دیگر عربی میں "اِنْ" اور "اِذَا" کا فرق کسی اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔ اگر عربی زبان کے کسی ابتدائی درجہ کے طالب علم سے بھی لفظ "اِذَا" کا معنی پوچھا جائے تو وہ بھی اس کا ترجمہ "جب" ہی بتائے گا نہ کہ "جو" یا "اگر" وغیرہ۔ بہرحال اس کا بالکل صحیح ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی "جب"۔

ثانیاً: اس آیت میں آنے والے لفظ "الارض" کے متعلق مفسرین کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے پوری دنیا مراد ہے دوسرا یہ کہ آیت شریفہ کے نزول کے وقت کا مسلمانوں کا ملک یعنی صرف مدینہ منورہ مراد ہے۔[3] دوسرا قول راجح ہے کیونکہ اول تو پہلے قول کو مفسرین بصیغۂ تمریض (بلفظ قیل) ذکر کرتے ہیں دوسرے اس لیے کہ بلاواسطہ اور براہِ راست منافقین کی فساد انگیزی مسلمانوں کے ملک (مدینہ منورہ) ہی میں تھی۔ اب دیکھیے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو مصباح القواعد ص۱۰۵ ج۲، [2] ملاحظہ ہو مصباح القواعد ص۶۷، ۸۵، ۱۱۱ ج دوم،

[3] ملاحظہ ہو حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص۳۲۸ ج۱۔

احمد رضا خان صاحب نے لفظی ترجمہ کے شوق میں "الارض" کا ترجمہ "زمین" کر دیا اور یہ نہ سوچا کہ اس ترجمہ سے معنی مراد واضح نہیں ہوتے اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے "الارض" کے اس معنی کو واضح کرتے ہوئے جو مفسرین کرام کے نزدیک راجح تھے، یہ ترجمہ فرمایا ہے "اور جب کہا جاتا ہے ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں"۔ یہاں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بریلوی حضرات کے اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے کہ دیوبندی حضرات لفظی ترجمہ کے شوق میں معنی مراد کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔

ع چلی تھی برچھی کسی پہ کسی کے آن لگی

خود خان صاحب بریلوی نے سورہ مائدہ کی درج ذیل آیت میں "الارض" کا ترجمہ "ملک" ہی سے کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ	(ترجمہ) وہ کہ اللہ اور اس کے
یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ	رسول سے لڑتے اور ملک
وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا	میں فساد کرتے پھرتے ہیں۔
(الآیۃ) المائدہ ۵: ۳۳	

لیکن اس موقعہ پر وہ لفظی ترجمہ کے شوق میں یہ بھول گئے کہ مفسرین کرام نے اس مقام پر "الارض" سے اس وقت کا مسلمانوں کا ملک مراد لینے کو ترجیح دی ہے۔

ثالثاً: "اِصلاح" بمعنی "ازالۂ فساد"، "اِفساد" یعنی فاسد کرنے کی ضد ہے اور مفسرین کرام "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فان شاننا لیس	(ترجمہ) کیونکہ ہمارا کام تو اصلاح
الا الاصلاح و ان	کرنا ہی ہے اور ہماری حالت
حالنا متمحضۃ	فساد کے شائبہ سے بھی منزہ
عن شوائب الفساد۔	اور پاک ہے۔

(بیضاوی شریف ص۲۹)

لیکن احمد رضا خان صاحب نے اس کا جو ترجمہ فرمایا ہے اس سے یہ مقصد واضح نہیں ہوتا کیونکہ فساد والی چیزوں کو بھی ملمع سازی کے ذریعہ سنوارا جا سکتا ہے چنانچہ سورہ نمل کی ایک آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے خان صاحب فرماتے ہیں۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا	(ترجمہ) میں نے اسے اور اس
یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ	کی قوم کو پایا کہ اللہ کو چھوڑ کر
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ	شیطان نے ان کے اعمال
اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ	ان کی نگاہ میں سنوار کر ان
عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا	کو سیدھی راہ سے روک دیا
يَهْتَدُوْنَ ۔ (النمل ۲۷: ۲۴)	تو وہ راہ نہیں پاتے۔

خان صاحب کے اس ترجمہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ "سنوارنا"، "ازالۂ فساد"، یا بالفاظ دیگر شائبہ فساد سے منزہ اور پاک ہونے کو مستلزم نہیں ہے بلکہ امور فاسدہ کو بھی ملمع سازی کے ذریعہ سنوار کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس سے ثابت ہوتا ہے "اصلاح" کا ترجمہ "سنوارنا" سے کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ "اصلاح"، عدم فساد کو مستلزم ہے جب کہ "سنوارنا"، عدم فساد کو مستلزم نہیں ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ

مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی "ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں"۔

رابعاً: اس آیت کے ترجمہ میں بھی احمد رضا خان صاحب نے قرآنی ترتیب کو بلاضرورت بدل ڈالا ہے چنانچہ اس آیت مبارکہ میں لفظ "قِیْلَ" پہلے ہے اور "لَهُمْ" بعد میں۔ لیکن خان صاحب "لھم" کا ترجمہ پہلے اور "قیل" کا ترجمہ پیچھے کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اور جو اُن سے کہا جائے"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ ترجمہ فرماتے ہیں "اور جب کہا جاتا ہے ان کو"۔

اسی طرح قرآنِ پاک میں "لَا تُفْسِدُوْا" پہلے ہے اور "فِی الْاَرْضِ" بعد میں لیکن خان صاحب قرآنی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمہ کرتے ہیں۔ "زمین میں فساد نہ کرو"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ حسب سابق قرآنی ترتیب کو پوری طرح مدِنظر رکھتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں "فساد نہ ڈالو ملک میں"۔ بہرحال خان صاحب کے ترجمہ میں پائے جانے والے تمام نقائص سے منزہ اور پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے۔ موصوف کا ترجمہ ملاحظہ ہو "اور جب کہا جاتا ہے ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں"۔

آیت (۱۲) اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"سنتا ہے! وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں"۔

یہ ترجمہ کئی وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اولاً: اس مقام پر حرف "اَلَا" تنبیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو بیضاوی شریف ص۲۹ وغیرہ اور اردو میں اس کا ترجمہ "آگاہ ہو"، "خبردار" ایسے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں لفظ فارسی ہیں جن کے معنی "جاننا" ہوتے ہیں ملاحظہ ہو "اردو فیروز اللغات" وغیرہ اسی لیے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ "جان لو" کیا ہے۔

اس کے برعکس خان صاحب نے اس کا ترجمہ "سنتا ہے" کیا ہے یہ لفظ اگر بطور "خبر" استعمال کیا ہے تو بھی غلط اور اگر بطور "استفہام" استعمال کیا ہے تو بھی غلط۔ اردو میں حرف تنبیہ کے طور پر "سُن، سنو، سنوجی، سنو تو سہی" تو استعمال ہوتے ہیں۔[۱] لیکن "سنتا ہے" کو بطور تنبیہ آج کل فصیح اردو میں استعمال نہیں کیا جاتا۔

بہرحال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ بڑا سلیس، واضح اور فصیح ہے جب کہ خان صاحب کا ترجمہ غیر فصیح اور مبہم بلکہ حقیقی معنی کے لحاظ سے تو بالکل غلط ہے۔

ثانیاً: "لٰکِنْ" حرف استدراک ہے لیکن احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ "مگر" کیا ہے جو اردو میں "شک وظن" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مومن کہتا ہے۔

شعر

بے چارہ بیقرار ہے درماں کی فکر میں
آگاہ میرے حال سے مشفق مگر نہیں

ملاحظہ ہو مصباح القواعد ص ۲۰۷ جلد دوم۔ اس شعر میں "مگر"، "شاید"

---

۱ ملاحظہ ہو مصباح القواعد ص ۹۵ / ۲۴

کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اس صورت میں " مگر انہیں شعور نہیں " کا مطلب بنے گا ۔ " شاید انہیں شعور نہیں " جس کا مرادِ خداوندی کے خلاف ہونا بالکل واضح ہے لیکن اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے جو ترجمہ فرمایا ہے اس سے خلافِ مقصود کا ایہام بالکل نہیں ہوتا وہ فرماتے ہیں " لیکن نہیں سمجھتے " اردو کا " لیکن " عربی کے " لٰکِن " کے لفظاً بھی قریب ہے اور خلاف مقصود کے ایہام سے بھی محفوظ۔

ثالثاً : " لَا يَشْعُرُوْنَ " " جملہ فعلیہ " ہے لیکن خانصاحب بریلوی اس کا ترجمہ " جملہ اسمیہ " والا کر رہے ہیں جو ظاہر ہے کہ بالکل غلط ترجمہ ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ ترجمانی ہے تو بھی غلط ہے جیساکہ آیت (۹) کے ذیل میں رابعاً کے ضمن میں ہم عرض کر چکے ہیں مکرر ملاحظہ فرما لیا جائے

ان تمام نقائص سے منزہ اور پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی

" جان لو ! وہی ہیں خرابی کرنے والے لیکن نہیں سمجھتے ۔

آیت (۱۳) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ؁

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے ۔

" اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنتا ہے وہی احمق ہیں مگر جانتے نہیں "۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے ۔

اولاً : اس ترجمہ سے کہ " جب ان سے کہا جائے ..... تو کہیں ..... " یہ واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات ان منافقین سے کہی گئی اور انہوں نے جواب میں یہ کہا بلکہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان سے کہا جائے تو وہ یہ کہیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مراد دوسرے معنی نہیں بلکہ پہلے معنی ہیں ۔ مرادِ خداوندی کو زیادہ نمایاں اور واضح کرنے والا ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی

" جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ ..... تو کہتے ہیں ..... "

ثانیاً : قرآنی ترتیب میں لفظ " قِيْلَ " پہلے اور لفظ " لَهُمْ " بعد میں واقع ہے لیکن خان صاحب نے قرآنی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے " لَهُمْ " کا ترجمہ پہلے اور " قِيْلَ " کا ترجمہ پیچھے کر دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں " جب ان سے کہا جائے " اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے قرآنی ترتیب کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے یعنی " جب کہا جاتا ہے ان کو "

ثالثاً : قرآن پاک میں لفظ " اٰمَنَ " پہلے اور " النَّاسُ " بعد میں واقع ہے لیکن احمد رضا خان صاحب نے قرآنی ترتیب کے برعکس ترجمہ کر دیا " جیسے اور لوگ ایمان لائے " جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ قرآنی ترتیب کے مطابق ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

" جس طرح ایمان لائے سب لوگ "

رابعاً : " اَلنَّاسُ " میں " الف لام " جنس کے لیے

ہے یا عہد کے لیے۔ ؎۱ لیکن احمد رضا خان صاحب نے اپنے ترجمہ میں ان دونوں
میں سے کسی کا ترجمہ نہیں کیا۔ علامہ بیضاوی نے اس مقام پر " الف لام " کے
" جنس " کے لیے ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ؎۲ صاحب کشاف نے " الف لام
جنس ماننے کی صورت میں " النّاس " کے دو معنی بیان کئے ہیں (۱)
کامل فی الانسانیت (۲) مومنین ہی انسان ہیں کیونکہ غیر مومن بہائم
میں داخل ہیں اور سید شریف رحمہ اللہ نے دونوں صورتوں میں استغراق مراد
لیا ہے۔ پہلی صورت میں استغراق ادعائی اور دوسری صورت میں استغراق
حقیقی۔ ؎۳ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے انہی مفسرین کی اتباع میں اپنے ترجمہ
کے اندر " استغراق " کو خوب واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں " جس
طرح ایمان لائے سب لوگ " اس کے برعکس احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ
سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ " النّاس " کے " الف لام " کے بارے میں
مفسرین کی تحقیقات سے بالکل بے خبر ہیں۔

خامسًا: قرآن پاک میں " اَنُؤْمِنُ " اور " کَمَآ اٰمَنَ " کی صورت
میں دو بار لفظ ایمان استعمال ہوا ہے لیکن احمد رضا خان صاحب " کَمَآ اٰمَنَ "
میں آنے والے لفظ " اٰمَنَ " کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں
" کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں " جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ
نے دونوں کا ترجمہ فرمایا ہے۔ کسی لفظ کا ترجمہ ان سے چھوٹا نہیں چنانچہ
وہ فرماتے ہیں۔

؎۱ ملاحظہ ہو بیضاوی شریف ص۳۰، البحر المحیط ص۶۷/ج۱، کشاف ص۱۸۲/ج۱، روح البیان ص۵۹/ج۱

؎۲ ملاحظہ ہو حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص۳۳۲/ج۱۔

؎۳ ملاحظہ ہو کشاف مع حاشیہ سید شریف ص۱۸۲/ج۱، حاشیۃ الشہاب ص۳۳۴/ج۱

" کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بے وقوف "۔

سادسًا: یہاں پر بھی قرآنی ترتیب کے خلاف " سُفَهَآءُ " کا
ترجمہ پہلے اور " نُؤْمِنُ " کا ترجمہ مؤخر کر دیا ہے چنانچہ خان صاحب فرماتے
ہیں۔ " احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں " جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ
کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے۔

سابعًا: خان صاحب نے اس مقام پر حرف تنبیہ " اَلَآ " کا
ترجمہ " سنتا ہے " کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آیت (۱۲) کے ذیل میں
" اَلَآ " کے ضمن میں عرض کر چکے ہیں۔

ثامنًا: حرف استدراک " لکن " کا ترجمہ " مگر " کرنے کے سلسلہ
میں ہم آیت (۱۲) کے ذیل میں " ثانیًا " کے ضمن میں عرض کر چکے ہیں۔ مکرر ملاحظہ کر
لیا جائے۔ بہرحال ان تمام خرابیوں سے منزہ ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند نور اللہ
مرقدہ نے فرمایا ہے یعنی " اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان
لائے سب لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف
جان لو! وہی ہیں بیوقوف لیکن نہیں جانتے "۔

آیت (۱۴) وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا
وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔
" اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب
اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں

ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں"۔
یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً: تو اسی بنا پر جو ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ یہ ترجمہ کہ "جب ...... ملیں تو کہیں" اور اسی طرح "جب اکیلے ہوں تو کہیں" اس بات پر واضح طور پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ "شرط و جزاء" یقیناً واقع ہو چکی ہیں جبکہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس "شرط و جزاء" کے وقوع پر قطعی طور پر دلالت کر رہا ہے وہ فرماتے ہیں "اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں" اسی طرح "جب تنہا ہوتے ہیں ..... تو کہتے ہیں۔

ثانیاً: قرآن پاک میں "لَقُوا" پہلے ہے اور "الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" بعد میں لیکن احمد رضا خان صاحب قرآنی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جب ایمان والوں سے ملیں"، جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے"۔

ثالثاً: خان صاحب فرماتے ہیں "جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے"۔ یہ ترجمہ منافقین کے مدعا کو پورے طور پر واضح نہیں کر رہا ہے کیونکہ منافقین کا مقصد تو مسلمانوں کو یہ بتلانا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اپنا مفہوم خوب، واضح کر رہا ہے وہ فرماتے ہیں "جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں"۔

رابعاً: "وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ" کا ترجمہ بھی خان صاحب نے قرآنی ترتیب کے خلاف کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں "اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ

قرآنی ترتیب کے مطابق ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اور جب تنہا ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس"۔

خامساً: "اِنَّا مَعَكُمْ" میں "حرف تحقیق" "اِنَّ" کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب چھوڑ گئے ہیں ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو "...... تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں "تو کہتے ہیں بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں" یہ "بے شک" حرف تحقیق "اِنَّ" ہی کا ترجمہ ہے جسے خان صاحب بالکل ترک کر گئے ہیں

سادساً: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ" کا ترجمہ خان صاحب نے فرمایا ہے "ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں" اس میں "یوں ہی" کا لفظ خان صاحب نے اپنی طرف سے یوں ہی بڑھا دیا ہے کیونکہ "اِنَّمَا" حصر کا کلمہ ہے۔ ترجمہ میں حصر کا مفہوم ادا کرنے کے لیے لفظ "تو" بڑھایا ہے اور "نحن" کا ترجمہ ہے "ہم" اور "مُسْتَهْزِءُوْنَ" کا ترجمہ ہے "ہنسی کرتے ہیں" تو اس جملہ کا مکمل اور صحیح ترجمہ ہوا "ہم تو ہنسی کرتے ہیں" یہی ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے جب کہ خان صاحب نے "یوں ہی" کا لفظ ترجمہ میں اپنی طرف سے داخل کر دیا۔

اس آیت کا بالکل صحیح اور ان نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی

"اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہا ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے)"

آیت (۱۵) اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔

"اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً: "بِھِمْ" قرآنی ترتیب میں پیچھے ہے لیکن خان صاحب نے ترجمہ میں اس کو مقدم کردیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں "اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے"۔

ثانیاً: نعیم الدین مرادآبادی صاحب اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

"یہاں جزاء استہزاء کو استہزاء فرمایا گیا تاکہ خوب دلنشیں ہوجائے کہ یہ سزا اس ناکردنی فعل کی ہے۔ ایسے موقع پر جزاء کو اسی فعل سے تعبیر کرنا آئینِ فصاحت ہے جیسے جزاءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ میں"۔

یہ نکتہ جو مرادآبادی صاحب نے ذکر فرمایا ہے متعدد تفاسیر میں مذکور ہے[1] لیکن افسوس کہ خان صاحب اپنے ترجمہ میں اس نکتہ کو ملحوظ نہ رکھ سکے چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر "اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ۝ اور اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ" میں منافقین کے

[1] مثلاً بیضاوی شریف ص۳۱، روح المعانی ص۱۵۸ ج۱

فعل اور اس کی جزاء کو ایک ہی لفظ سے تعبیر کیا ہے یا جیسے جَزٰؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا، میں اصل فعل اور اس کی جزاء کو ایک ہی لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اسی طرح خان صاحب بھی اپنے ترجمہ میں اصل متن کی طرح ایک ہی لفظ استعمال فرماتے تاکہ باقرار مرادآبادی صاحب "آئین فصاحت" کا تقاضا پورا ہوجاتا۔ لیکن انہوں نے دونوں جگہ ترجمہ میں لفظ بدل کر "آئین فصاحت" کا بیڑا غرق کردیا۔ چنانچہ ان کا ترجمہ پھر ملاحظہ ہو "ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں"، اور "اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے" اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو وہ فرماتے ہیں۔

"ہم تو ہنسی کرتے ہیں" اور "اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے"

ثالثاً: "یَمُدُّھُمْ" کی تفسیر میں ایک قول املاء یعنی ڈھیل دینے کا ہے جب کہ محققین کا قول ہے کہ اس کا مطلب ترقی دینا، بڑھانا اور اضافہ کرنا ہے۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ نے تو ڈھیل دینے کے معنی کو اس موقعہ پر بعض قرائن کی بنیاد پر غلط قرار دیا ہے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص۷۱ ج۲ اور صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ڈھیل دینے کے معنی کو بالکل غلط تو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا احتمال بہرحال قائم ہے ان کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

والحق ان الامھال ھنا محتمل یعنی حق بات یہ ہے کہ ڈھیل دینے کے معنی کا احتمال یہاں ہے۔ اور امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے دونوں قولوں میں تطبیق دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ

[1] ملاحظہ ہو کشاف ص۱۸۱ ج۱، حاشیہ سید شریف علی الکشاف ص۱۸۸ ج۱، روح البیان ص۶۳ ج۱، مراح لبید ص۵ ج۱، البحر المحیط ص۶۳ ج۱، النہر الماد علی ہامش البحر المحیط ص۱۷ ج۱۔

واولی ھذہ الاقوال بالصواب فی قولہ ویمدھم ان یکون بمعنی یزیدھم علی وجہ الاملاء الخ۔

(تفسیر طبری ص۱۰۵ ج۱ وابن کثیر ص۵۳ ج۱)

بہرحال واضح ہوگیا کہ خان صاحب بریلوی نے جو ترجمہ فرمایا ہے وہ صاحب کشاف اور امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک تو بالکل غلط ہے اور اگر بعض مفسرین کے کہنے کے مطابق اس معنی کو بالکل غلط نہ بھی قرار دیں تو بھی اس کے مرجوح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ اس معنی سے معتزلہ کے مسلک کو بھی تقویت ملتی ہے ملاحظہ ہو بیضاوی شریف درسی ص۳۲ حاشیہ ۶۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہندؒ نے جمہور محققین مفسرین کی تفسیر کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔ ”اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں“، جبکہ خان صاحب نے غلط یا کم از کم مرجوح معنی کو اختیار کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں ”انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں“۔

رابعًا: جمہور مفسرین کے نزدیک ”فِی طُغْیَانِھِمْ“ راجح قول کے مطابق ”یَمُدُّھُمْ“ کے ساتھ متعلق ہے[1] کیونکہ بلا ضرورۃ متعلقات فعل کو فعل پر مقدم ماننا خلاف اصل ہے اور بعض مفسرین کا ”یَعْمَھُوْنَ“ سے متعلق ہونے کے احتمال کو ذکر کرنا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کو وہ راجح بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن احمد رضا خان صاحب نے اس خلاف اصل احتمال کو ترجیح دیتے ہوئے اور ”فِی طُغْیَانِھِمْ“ کو ”یَعْمَھُوْنَ“ سے متعلق قرار دے کر ترجمہ کیا ہے یعنی ”اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں“۔ جبکہ حضرت

[1] ملاحظہ ہو روح البیان ص۶۳ ج۱۔

شیخ الہند رحمہ اللہ نے اصل اور قاعدہ کے مطابق جار مجرور کو مؤخر اور فعل کو مقدم مانتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ”ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں“۔

خامسًا: ”یَعْمَھُوْنَ“ کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ ترکیب میں ”حال“ واقع ہے[1] لیکن احمد رضا خان صاحب نے ترجمہ میں اس جملہ کے ”حال“ ہونے کا لحاظ نہیں رکھا جبکہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں اس جملہ کے ”حال“ ہونے کو بھی واضح فرمادیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”(اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں“۔

سادسًا: ”عَمَہٌ“ کے اصل معنی راستوں میں ان علامات اور نشانیوں کا ہونا جن سے راستوں کا تعین ہو سکے اور چونکہ ایسی حالت میں انسان اپنے صحیح راستہ کے بارے میں متردد و متحیر ہو جاتا ہے اس لیے ”عَمَہٌ“ کا اطلاق مجازی طور پر تردد وغیرہ پر بھی کر دیا جاتا ہے ملاحظہ ہو حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص۳۵۴ ج۱۔ اسی مجازی معنی کو اختیار کرتے ہوئے احمد رضا خان صاحب نے ترجمہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں ”اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں“ کیونکہ ”بھٹکنا“ تردد و تحیر ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے لیکن احمد رضا خان صاحب اس حقیقت کو نہ معلوم کر سکے کہ محققین مفسرین نے اس معنی کو یہاں پر غیر موزوں اور نامناسب قرار دیا ہے چنانچہ روح المعانی میں ہے۔

[1] ملاحظہ ہو البحر المحیط ص۷۱ ج۱، روح المعانی ص۱۶۱ ج۱، نیشاپوری علی ہامش الطبری ص۱۶۲ ج۱، املاء مامن بہ الرحمٰن ص۲ ج۱، تفسیر نسفی ص۲۲ ج۱۔

لان المنافقين لم يكونوا مترددين في الكفر بل كانوا مصرين عليه معتقدين انه الحق وماسواه باطل[1]

(ترجمہ) کیونکہ منافقین کفر میں متردد نہیں تھے بلکہ وہ کفر پر مصر تھے۔ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہی حق ہے اور اسکے ماسوا باطل ہے۔

”عمہ“ کا دوسرا استعمال ”فقدان بصیرت“ میں ہوتا ہے جیسا کہ ”عمی“ کا استعمال ”فقدان بصر“ میں[2] اور یہی معنی اس مقام پر راجح ہیں[3] اور اسی راجح معنی کے مطابق حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے یعنی ”حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں“۔

نوٹ: بعض بریلوی حضرات حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کے ترجمہ ”اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے“ پر اعتراض کرتے ہیں ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ احمد رضا خان صاحب نے ترجمہ فرمایا ہے۔ ”اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے“ اور ”استہزاء“ کا معنی ہے ”ہنسی، مذاق، ٹھٹھول، مذاق کرنا، ہنسی اڑانا، ٹھٹھا کرنا“ ملاحظہ ہو فیروز اللغات اردو اور نسیم اللغات وغیرہ۔ لہٰذا معترضین کو چاہیئے کہ ”استہزاء“ کے معنی اور احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اعتراض کرنا چاہیں کریں پھر ہم بھی انشاء اللہ جواب پیش کردیں گے۔

---

[1] ملاحظہ ہو بیضاوی شریف ص ۳۲ ج ۱، روح المعانی ص ۱۶۰ ج ۱، تفسیر کبیر ص ۷۱ ج ۲ وغیرہ

[2] ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۶۰ ج ۱، البحر المحیط ص ۷۱ ج ۱ وغیرہ۔

[3] روح المعانی ص ۱۶۰ ج ۱ ومثلہ فی البحر المحیط ص ۷۱ ج ۱

آیت (۱۶) أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے“۔

اس ترجمہ میں متعدد نقائص پائے جاتے ہیں۔

اولاً: ”اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ“ میں مبتدا اور خبر دونوں کے معرفہ ہونے کے باعث ”حصر“ پایا جاتا ہے۔[1] لیکن احمد رضا خان صاحب ”حصر“ سے بے خبر ہونے کے باعث ترجمہ کر رہے ہیں ”یہ وہ لوگ ہیں“ جب کہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے ”حصر“ کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے یعنی ”یہ وہی ہیں“۔

ثانیاً: ”اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى“ کے ترجمہ میں بھی خان صاحب نے الفاظ قرآنی کی ترتیب کے مطابق ترجمہ نہیں کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی“ جبکہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ قرآنی ترتیب کے بالکل مطابق ہے، وہ فرماتے ہیں ”جنہوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے“۔

ثالثاً: احمد رضا خان صاحب نے ”تجارت“ کا ترجمہ ”سودا“ کیا ہے حالانکہ ”سودا“ کا اطلاق جس طرح خرید و فروخت یعنی تجارت

---

[1] ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۶۰ ج ۱

پر ہوتا ہے اسی طرح بیچی اور خریدی ہوئی چیز پر بھی " سودا " کا اطلاق ہوتا ہے اسی لیے " سودا مول لینا " " سودا لانا " اور " سودا بیچنا " ایسے محاورات بولے جاتے ہیں - اس لیے اس ترجمہ سے اس بات کا ایہام پیدا ہوتا ہے کہ تجارت میں گھاٹا نہیں ہوا بلکہ سودا ہی خراب تھا یعنی مبیع جو کہ ہدایت ہے وہی خراب تھا لہٰذا اس کے بدلے میں جو ملے گا وہ بھی خراب ہی ہوگا حالانکہ یہ مفہوم مراد خداوندی کے بالکل خلاف ہے اس کے برعکس " تجارت " کا بے غبار ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی " سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری "۔

<u>رابعاً</u> : احمد رضا خان صاحب نے " فَمَا رَبِحَتْ " میں " ف " کا ترجمہ " تو " کیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس " ف " کو " فاء جزائیہ " سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ محققین مفسرین نے اس کو بالکل غلط قرار دیا ہے [1] اس لیے اس کا زیادہ صحیح اور بے غبار ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی " سو نافع نہ ہوئی انکی سوداگری "۔

<u>خامساً</u> : " اِهْتَدَاءٌ " کے معنی راستہ پانے کے ہوتے ہیں اس لیے " مهتدین " کا ترجمہ ہوگا " راستہ پانے والے " لیکن احمد رضا خان صاحب اس کا ترجمہ " راستہ جاننے " سے کر رہے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں " اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے " جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کے اصل اور حقیقی معنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے ، ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو " اور نہ ہوئے راہ پانے والے "۔

---

[1] ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۶۱ / ج ۱ ، البحر المحیط ص ۷۲ / ج ۱

<u>سادساً</u> : احمد رضا خان صاحب نے ترجمہ میں اپنی طرف سے " سودے کی راہ " کے الفاظ بڑھا دیئے ہیں حالانکہ متن میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ " سودا " بنتا ہو - اگر وہ تشریح و تفسیر کے لیے اپنی طرف سے کچھ بڑھانا چاہتے تھے تو انہیں چاہیئے تھا کہ اس اضافہ کو بریکٹ یعنی قوسین کے اندر درج کرتے جیسا کہ آیت (۱۵) کے ترجمہ میں کچھ الفاظ تشریح کے طور پر موصوف نے بڑھائے ہیں لیکن بریکٹ کے اندر اسی طرح یہاں بھی ہونا چاہیئے تھا - یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خان صاحب نے جو تشریحی الفاظ بڑھائے ہیں آیت کی یہی تشریح قطعی طور پر متعین ہے بلکہ اس آیت کی تفسیر میں اور بھی متعدد احتمالات ہیں ملاحظہ ہو البحر المحیط ص ۷۳ / ج ۱ - بلکہ " ابوحیان " نے احمد رضا خان صاحب کی ذکر کردہ تفسیر کے خلاف دوسرے قول کو اختیار کیا ہے - بہرحال ترجمہ میں اس طرح اپنے الفاظ کو داخل کر دینا کہ دیکھنے والے کو یہ پتہ ہی نہ چل سکے کہ کون سے الفاظ مترجم کے اپنے داخل کردہ ہیں اور کون سے الفاظ قرآنی الفاظ کا ترجمہ ہیں ، درحقیقت تحریف قرآن کے لیے دروازہ کھولنے کے مترادف ہے - بہرحال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ ان تمام عیوب و نقائص سے بالکل مبرا اور منزہ ہے - ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

" یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے
سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری اور نہ ہوئے راہ پانے والے "

<u>آیت (۱۷)</u> مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے۔

"ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اُس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا"

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً: "مَثَل" کا ترجمہ خان صاحب نے "کہاوت" کیا ہے حالانکہ اس مقام پر "مثل" سے "ضرب المثل" اور "کہاوت" مراد نہیں ہے [1]

ثانیاً: "اَضَاءَتۡ" میں اگرچہ "لازم" ہونے کا احتمال ہے لیکن اولی اور راجح اس کا "متعدی" ہونا ہے ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۶۵ ج۱ لیکن احمد رضا خان صاحب نے غیر اولی اور مرجوح احتمال کو اختیار کرتے ہوئے اور "اَضَاءَتۡ" کو فعل لازم قرار دیتے ہوئے ترجمہ کیا ہے یعنی "آس پاس سب جگمگا اٹھا" جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے راجح قول کو اختیار فرماتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں "روشن کر دیا آگ نے اسکے آس پاس کو"

ثالثاً: احمد رضا خان صاحب نے اپنے ترجمہ میں کچھ ایسے الفاظ بھی داخل کر دیئے ہیں جن کا متن قرآن پاک میں موجود اصل الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو "جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا" اس ترجمہ میں "اس سے" اور "سب" کے الفاظ موصوف نے اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں۔

رابعاً: "مَا حَوۡلَهٗ" میں "مضاف الیہ" واقع ہونیوالی

---

[1] ملاحظہ ہو حاشیۃ الشہاب ص ۳۶۵ ج۱، شیخ زادہ ص ۱۵۲ ج۱ وغیرہ

"ضمیر مجرور" (ہٖ) کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کا ترجمہ کمی زیادتی کے ان دونوں نقائص سے بالکل پاک ہے وہ فرماتے ہیں "جب روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو"۔ اس میں لفظ "اس کے" "ضمیر مجرور (ہٖ)" کا ہی ترجمہ ہے جسے خان صاحب چھوڑ گئے تھے۔

خامساً: "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ" کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں ایک یہ کہ یہ "جملہ مستانفہ" ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ "لَمَّا" کا جواب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد رضا خان صاحب نے اس کو "جملہ مستانفہ" قرار دیکر ترجمہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا حرف ربط جس سے اس کا جواب "لَمَّا" ہونا واضح ہو جائے نہیں ذکر کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ "جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا" حالانکہ اس کو "جملہ مستانفہ" قرار دینا ایک مرجوح قول ہے جس کے بارے میں صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ جس شخص میں ذرہ بھر انصاف ہوگا اس پر اس قول کی رکاکت مخفی نہیں رہ سکتی ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۶۵ ج۱ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے راجح قول کے مطابق اس کو "لَمَّا" کا جواب قرار دیتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے اور اپنے ترجمہ میں اس کا جواب ہونا واضح فرما دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "جب روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے ان کی روشنی"

سادساً: احمد رضا خان صاحب نے "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ" کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے یعنی "اللہ ان کا نور لے گیا" حالانکہ محض تھوڑا بہت نور لے جانا مراد نہیں ہے بلکہ نور کا بالکلیہ زائل کر دینا مراد ہے چنانچہ روح البیان ص ۶۱ ج۱

میں ہے "والمراد ازالتہ بالکلیۃ" یعنی نور کا بالکلیہ زائل کردینا مراد ہے اس لیے حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے معنی مراد کو واضح کرتے ہوئے یہ ترجمہ فرمایا ہے "تو زائل کردی اللہ نے ان کی روشنی"

سابعاً: "ظُلُمٰتٍ" کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے۔ "اندھیریوں" جو "اندھیری" کی جمع ہے جس کا ایک معنی "گھوڑے کی آنکھوں پر ڈالا جانے والا نقاب" بھی ہے ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ ص۲۴۷ ج۱ نیز عرفِ عام میں "اندھیری" کا اطلاق "آندھی" پر بھی ہوتا ہے۔ اس سیلئے ترجمہ میں ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے خلافِ مقصود معنی کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہو، مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ثامناً: "لَا یُبْصِرُوْنَ" فعل مضارع معلوم کا صیغہ ہے جس کی ضمیر فاعل سے منافقین مراد ہیں اور "مفعول" دیکھے جانے والی اشیاء ہیں لیکن احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ ایسے فعل سے کیا ہے جس کا فاعل "منافقین" کی بجائے وہ اشیاء بن رہی ہیں جو دیکھی جاتی ہیں اور "منافقین" بجائے "فاعل" بننے کے "مفعول" بن جاتے ہیں موصوف کا ترجمہ ملاحظہ ہو "کچھ نہیں سوجھتا"، جس کا مطلب بنتا ہے کہ کوئی دیکھے جانے والی چیز منافقین کو نہیں سوجھتی گویا جو چیز قرآنی ترکیب میں "مفعول" بن رہی تھی وہ رضاخانی ترجمہ میں "فاعل" بن گئی اور جو قرآنی ترکیب میں "فاعل" بن رہے تھے وہ رضاخانی ترجمہ میں "مفعول" بن گئے۔ بہرحال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ ان تمام نقائص سے پاک ہے ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں

"اُن کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب روشن کردیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کردی اللہ

نے ان کی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے"۔

آیت (۱۸) صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔

اس آیت مقدسہ کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے فرمایا ہے "بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اولاً: "صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ" کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ یکے بعد دیگرے خبریں ہیں مبتداء محذوف "ھُمْ" کی ملاحظہ ہو اکلیل علی مدارک التنزیل ص۸۱ ج۱، لیکن احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ سے "خبر" ہونا تو درکنار "جملہ" ہونا ہی معلوم نہیں ہوتا کیونکہ انکا ترجمہ ہے "بہرے گونگے اندھے" اس میں حرف ربط وغیرہ نہ ہونے کے باعث ان کا جملہ ہونا ہی معلوم نہیں ہوتا اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان کا خبر ہونا اپنے ترجمہ میں خوب واضح کردیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں

"بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں"۔

ثانیاً: "لَا یَرْجِعُوْنَ" "فعل مضارع" منفی کا صیغہ ہے لیکن احمد رضا خان صاحب اس کا ترجمہ "اسم فاعل" والا کر رہے ہیں وہ لکھتے ہیں۔ "وہ پھر آنے والے نہیں" جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس "فعل مضارع" کے معنی مراد کو واضح کرتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے یعنی "سو وہ نہیں لوٹیں گے"۔

ثالثاً: "لَا یَرْجِعُوْنَ" کے ذیل میں مفسرین کرام لکھتے

ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین اپنے نفاق وغیرہ سے کبھی نہیں لوٹیں گے۔[1] لیکن احمد رضا خان صاحب نے جو ترجمہ فرمایا ہے اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ منافقین پھر کبھی نہیں لوٹیں گے۔ بلکہ ان کے ترجمہ سے منافقین کا لوٹ آنا ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے کیونکہ اردو میں اس قسم کے جملے کسی فعل کے قطعی طور پر غیر واقع ہونے پر دلالت نہیں کرتے بلکہ اس قسم کے جملے عام حالات، کسی شخص کے عمومی مزاج اور افتاد طبع سے قیاس کردہ نتائج پر دلالت کرتے ہیں مثلاً فلاں شخص ماننے والا نہیں، یا وہ آنے والا نہیں یا فلاں آدمی ایسا کام کرنے والا نہیں وغیرہ جملوں سے قطعی طور پر فعل کا کبھی بھی واقع نہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ "وہ پھر آنے والے نہیں" کی بہ نسبت حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ "وہ نہیں لوٹیں گے" مفسرین کی بیان کردہ مراد کو زیادہ واضح کر رہا ہے۔

آیت (۱۹) اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔

"یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔"

---

۱ ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص ۷۶ ج ۲، البحر المحیط ص ۸۲ ج ۱ وغیرہ۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً: "اَوْ كَصَيِّبٍ" کا عطف ہے "الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا" پر[1] لیکن احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا عطف کس پر ہے جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں اس کو خوب نمایاں کر دیا ہے وہ فرماتے ہیں "یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے"۔

ثانیاً: "صَيِّبٍ" کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے "اترتا پانی"، اگرچہ "بارش" اور "مینہ" اس "اترتا پانی" سے زیادہ واضح اور فصیح ترجمہ ہے لیکن بایں ہمہ یہ ترجمہ اس مقام پر صحیح نہیں ہے کیونکہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ "تنوین تنکیر" وغیرہ کے باعث یہاں "صَيِّبٍ" سے مراد "زور دار بارش" ہے۔[2] اس لیے اس کا زیادہ صحیح ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "زور سے مینہ پڑ رہا ہو"، اس ترجمہ سے نہ صرف یہ کہ "صَيِّبٍ" کا ترجمہ ہوا بلکہ اس کی تنوین تنکیر اور اس کے لغوی معنی (صوب بمعنی نزول) کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کیونکہ "پڑنا" نزول پر دلالت کرتا ہے۔

ثالثاً: احمد رضا خان صاحب نے "ظُلُمٰتٌ" کا ترجمہ "اندھیریاں" کیا ہے جو "اندھیری" کی جمع ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آیت (۱۷) کے ذیل میں "سایعا" کے ضمن میں عرض کر چکے ہیں۔

رابعاً: خان صاحب نے "برق" کا ترجمہ "چمک" کیا ہے

---

۱ ملاحظہ ہو روح المعانی ص ۱۷۱ ج ۱، بیضاوی شریف ص ۳۵ وغیرہ

۲ ملاحظہ ہو بیضاوی شریف ص ۳۶، شیخ زادہ علی البیضاوی ص ۱۶۵ ج ۱، حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص ۳۹۳ ج ۱۔

حالانکہ محض "چمک"، "برق"، سے مراد نہیں ہے بلکہ "برق"، سے مراد
وہ لطیف چمکدار آگ ہے جو بادلوں میں دکھائی دیتی ہے ملاحظہ ہو روح المعانی
ص ۱۷۲/۱ اس لیے اس کا زیادہ صحیح ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے
فرمایا ہے یعنی "بجلی"، خان صاحب نے بھی آئندہ آیت میں "برق"، کا
ترجمہ "بجلی"، ہی کیا ہے۔ بہرحال ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے
جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے
زور سے مینہ پڑ رہا ہو آسمان سے اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی
دیتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے موت کے ڈر سے
اور اللہ احاطہ کرنے والا ہے کافروں کا"۔

آیت (۲۰) يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ
كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ
عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔
"بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی
جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے
رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا بیشک
اللہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

یہ ترجمہ کئی وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً: "یَکَادُ"، "افعال مقاربہ"، میں سے ہے جو قرب
خبر پر دلالت کرنے کے لیے وضع ہوا ہے لیکن حیرت ہے کہ احمد رضا

خان صاحب اس کا ترجمہ "معلوم ہونا"، سے کر رہے ہیں شاید وہ اسے
"افعال قلوب"، میں سے سمجھے ہوئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "بجلی یوں
معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی"، اس کے برعکس حضرت
شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کا بالکل صحیح ترجمہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔
"قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی آنکھیں"۔

ثانیاً: احمد رضا خان صاحب لفظ "لَهُمْ"، اور "عَلَيْهِمْ"
کا ترجمہ ترک کر گئے ہیں۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو "جب کچھ چمک ہوئی اس
میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے"۔ احمد رضا خان صاحب
کو چاہیے تھا کہ یا تو ان دونوں لفظوں کا ترجمہ علیحدہ علیحدہ کرتے یا ایک
بار ترجمہ کر کے دوسرے جملہ کو پہلے پر عطف کر دیتے۔ اس طرح "معطوف"
میں بھی اس کا لحاظ ہو جاتا جس کا لحاظ "معطوف علیہ"، میں کیا گیا ہے
لیکن احمد رضا خان صاحب دونوں ہی صورتیں ترک کر گئے جب کہ حضرت
شیخ الہند رحمہ اللہ نے دوسری صورت کو اختصار کے پیش نظر اختیار فرمایا
ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی
روشنی میں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں"۔

ثالثاً: احمد رضا خان صاحب نے "كُلَّمَا أَضَاءَ"، کا
ترجمہ فرمایا ہے "جب کچھ چمک ہوئی"، اس ترجمہ میں لفظ "کچھ"، اپنی طرف
سے خان صاحب نے بڑھا دیا ہے جب کہ متن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے
جس کا ترجمہ "کچھ"، ہو۔

رابعاً: "وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ"، میں آنے والے لفظ
"لَوْ"، کا ترجمہ خان صاحب چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے اس کا ترجمہ

کیا ہے" اور اللہ چاہتا"، جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمہ میں
اس کا ترجمہ ترک نہیں ہوا ہے وہ فرماتے ہیں" اور اگر چاہے اللہ"۔

خامساً: "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"، کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے "بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے" اس پر حاشیہ لکھتے ہوئے نعیم الدین مراد آبادی صاحب رقمطراز ہیں۔

"شئ اسی کو کہتے ہیں جسے اللہ چاہے اور جو تحت مشیت آسکے، تمام ممکنات شئ میں داخل ہیں اس لیے وہ تحتِ قدرت ہیں۔ اور جو ممکن نہیں واجب یا ممتنع ہے اس سے قدرت وارادہ متعلق نہیں ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات واجب ہیں اس لیے مقدور نہیں۔ مسئلہ: باری تعالیٰ کے لیے جھوٹ اور تمام عیوب محال ہیں اسی لیے قدرت کو ان سے کچھ واسطہ نہیں"۔

مراد آبادی صاحب نے اپنے اس حاشیہ میں "مسئلہ عموم قدرت" کا ذکر چھیڑا ہے اور اس کا ذکر چھیڑنے کا مقصد احمد رضا خان صاحب پر سے اس سنگین اعتراض کو اٹھانا ہے کہ موصوف نے اس ترجمہ (کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے) کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میں ہر عیب و نقص کے پائے جانے کا امکان تسلیم کر لیا ہے اور یہ کہ خان صاحب نے مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ درحقیقت ان کے اپنے عقائد و نظریات ہیں جن کی تشہیر مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کے حوالہ سے کر رہے ہیں۔

خان صاحب حضرت شہید قدس سرہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"وہابی ایسے کو خدا کہتا ہے جسے مکان، زمان، جہت، ماہیت ترکیب عقلی سے پاک کہنا بدعت حقیقیہ کے قبیل سے اور صریح کفروں کے ساتھ گننے کے قابل ہے۔ اس کا سچا ہونا کچھ ضرور نہیں جھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے کو کہ جس کی بات پر اعتبار نہیں۔ نہ اس کی کتاب قابل استناد، نہ اس کا دین لائق اعتماد ایسے کو جس میں ہر عیب و نقص کی گنجائش ہے جو اپنی مشیت بنی رکھنے کو قصداً عیبی بننے سے بچتا ہے۔ چاہے تو ہر گندگی میں آلودہ ہو جائے۔ ایسے کو جس کا علم حاصل کئے سے حاصل ہوتا ہے اس کا علم اس کے اختیار میں ہے چاہے تو جاہل رہے ایسے کو جس کا بہکنا، بھولنا، سونا، اونگھنا، غافل رہنا، ظالم ہونا حتی کہ مرجانا سب کچھ ممکن ہے۔ کھانا پینا، پیشاب کرنا پاخانہ پھرنا، ناچنا، تھرکنا، نٹ کی طرح کلا کھیلنا، عورتوں سے جماع کرنا، لواطت جیسی خبیث بے حیائی کا مرتکب ہونا حتی کہ مخنث کی طرح خود مفعول بننا کوئی خباثت، کوئی فضیحت اس کی شان کے خلاف نہیں، وہ کھانے کا منہ اور بھرنے کا پیٹ اور مردی اور زنی کی علامتیں بالفعل رکھتا ہے۔ صمد نہیں جوف دار کھکل ہے، سبوح قدوس نہیں خنثی مشکل ہے یا کم سے کم اپنے آپ کو ایسا بنا سکتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو جلا بھی سکتا ہے ڈبو بھی سکتا ہے، زہر کھا کر یا اپنا گلا گھونٹ کر، بندوق مار کر خودکشی بھی کر سکتا ہے، اس کے ماں باپ جورو، بیٹا سب ممکن ہیں بلکہ ماں باپ ہی سے پیدا ہوا ہے

ربڑ کی طرح پھیلتا سمٹتا ہے، برہما کی طرح چومکھا ہے۔ ایسے کو جس کا کلام فنا ہو سکتا ہے جو بندوں کے خوف کے باعث جھوٹ سے بچتا ہے کہ کہیں وہ مجھے جھوٹا نہ سمجھ لیں، بندوں سے چھپا چھپا کر پیٹ بھر کر جھوٹ بک سکتا ہے۔ ایسے کو جس کی خبر کچھ ہے اور علم کچھ۔ خبر سچی ہے تو علم جھوٹا۔ علم سچا ہے تو خبر جھوٹی۔ ایسے کو جو سزا دینے پر مجبور ہے۔ نہ دے تو بے غیرت ہے۔ معاف کرنا چاہے تو حیلے ڈھونڈتا ہے۔ خلق کی آڑ لیتا ہے۔ ایسے کو جس کی خدائی کی اتنی حقیقت کہ جو شخص ایک پیڑ کے پتے گن دے اس کا شریک ہو جائے۔ جس نے اپنا سب سے بڑھ کر مقرب ایسوں کو بنایا جو اس کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔ جو چوڑوں چماروں سے لائق تمثیل ہیں۔ ایسے کو جس نے اپنے کلام میں خود شرک بولے اور جا بجا بندوں کو شرک کا حکم دیا۔ قرآن عظیم تو فرمائے اَغۡنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهٖ۔ انہیں اللہ و رسول نے اپنے فضل سے دولت مند کر دیا اور مسلمانوں کو اس کہنے کی ترغیب دے۔ حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗ۔ ہمیں اللہ کافی ہے اب دیتے ہیں اللہ و رسول ہمیں اپنے فضل سے اور وہابیہ کا خدا اسمٰعیل دہلوی کے کان میں پھونک جائے الیٰ آخرہ[1]

درحقیقت بریلوی حضرات کا یہ عام دستور ہے کہ جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے فلاں عقیدہ و نظریہ کو عوامی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا تو فوراً اس

[1] فتاویٰ رضویہ صـ ۷۹ ج ۱

نظریہ کو دوسروں کے سر تھوپ کر عوامی مخالفت سے بچنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں حالانکہ چاہیئے تو یہ کہ اگر انہیں اپنی غلطی کا احساس واقعتہً ہو گیا ہو تو اپنی غلطی کا اقرار کر کے اس سے علی الاعلان رجوع کر لیں اور اگر یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کی مخالفت جہالت پر مبنی ہے تو پھر ڈٹ کر اپنے موقف کو پیش کریں اور اللہ کے لیے اس مخالفت کو برداشت کریں اور کلمۂ حق کہنے سے کسی صورت دستبردار نہ ہوں۔ لیکن بریلوی حضرات اس معقول طرزِ عمل کو ترک کر کے اور اپنا نظریہ دوسروں کے سر تھوپ کر عوامی مخالفت سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس موقعہ پر بریلویوں کے اس طرزِ عمل کی ایک دو مثالیں ذکر کر دینا ہم مناسب سمجھتے ہیں تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے۔

پہلی مثال: بریلوی حضرات نے شور مچا رکھا ہے کہ علماء دیوبند شیطان کا علم معاذ اللہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ مانتے ہیں حالانکہ علماء دیوبند نے ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار اعلان کیا ہے کہ جو شخص شیطان کا علم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ مانے وہ ہمارے نزدیک کافر و مرتد ہے، لیکن بریلوی ہیں کہ ہزاروں بار کی تردید کے باوجود اپنا الزام دہراتے چلے جا رہے ہیں اور اصل صورتِ حال یہ ہے کہ یہ عقیدہ بریلوی حضرات کی کتابوں میں ملتا ہے کہ شیطان کا علم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ ہے۔ چنانچہ احمد رضا خان صاحب کی کتاب خالص الاعتقاد صـ ۵ پر ہے کہ "ابلیس کا علم معاذ اللہ علم اقدس سے ہرگز وسیع تر نہیں"۔ ظاہر ہے کہ شیطان کے علم کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے "وسیع تر" یعنی زیادہ وسیع ہونے کی نفی سے واضح طور پر لازم آ رہا ہے کہ نفس وسعت کے تو یہ حضرات خود ہی قائل ہیں لیکن الزام دوسروں پر دھر رہے ہیں۔ شیطان اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں تقابل

کر کے شیطان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھا کر پیش کرنے کا کام خود کرتے ہیں اور الزام علماء دیوبند پر لگا دیتے ہیں۔ احمد رضا خان صاحب کی مصدقہ کتاب انوار ساطعہ میں ہے۔

" اور تماشا یہ کہ اصحاب محفل میلاد تو زمین کی تمام جگہ پاک و ناپاک مجالس مذہبی و غیر مذہبی میں حاضر ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہیں دعویٰ کرتے۔ ملک الموت، اور ابلیس کا حاضر ہونا اس سے بھی زیادہ تر مقامات پاک ناپاک، کفر غیر کفر میں پایا جاتا ہے"۔ (انوار ساطعہ ص۵۶ مصدقہ احمد رضا خان صاحب)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ بڑا حاضر ناظر شیطان کو مانتے خود ہیں لیکن الزام علماء دیوبند پر لگاتے ہیں کہ وہ شیطان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھاتے ہیں (العیاذ باللہ)۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ جب بریلوی حضرات نے شیطان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھانے والی اپنی غلطی کا احساس کر لیا تھا تو اپنی غلطی کا اقرار کر کے ان عبارات سے رجوع کا اعلان کر دیتے نہ یہ کہ اپنی ان عبارات سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے علماء دیوبند پر مسلسل الزام تراشی کر کے ان کو علماء دیوبند کے خلاف بھڑکانے کے لیے ناجائز اور گھٹیا حربے استعمال کئے جاتے لیکن افسوس کہ انہوں نے معقول اور بالکل صحیح راستہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے لیے غلط راستہ کا انتخاب کر لیا جس میں نہ صرف ان کا بلکہ پوری امت کا عظیم نقصان ہے۔

دوسری مثال: ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ جن میں بریلوی علماء نے اپنی رائے وہی ظاہر کی ہے جو علماء دیوبند فرماتے ہیں مثلاً دعاء بعد نماز جنازہ، نور و بشر، علم غیب، اور ختم وایصال ثواب وغیرہ مسائل میں لیکن عوامی مخالفت

یادداشت نہ کر سکنے کے باعث اپنے ذکر کردہ مسائل کو بھی علماء دیوبند کے مسائل قرار دے کر اب بریلوی علماء مخالفت کر رہے ہیں۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ احمد رضا خان صاحب کا یہ ترجمہ (کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے) ببانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ خان صاحب نے مولانا اسمٰعیل شہید قدس سرہ کے بارے میں "فتاویٰ رضویہ" کے اندر جو کچھ لکھا ہے وہ سب خان صاحب ہی کے خیالات و نظریات ہیں جو وہ مولانا اسمٰعیل شہید قدس سرہ کے حوالہ سے شائع کر رہے ہیں۔ اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے مراد آبادی صاحب نے مندرجہ بالا حاشیہ لکھا ہے لیکن وہ بھی "بھولے بادشاہ" ہیں انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ یہ اعتراض قرآن پاک کی آیت پر نہیں ہے کہ آپ "شیٔ" یا بالفاظ دیگر "چیز" کی حقیقت بیان کر کے اعتراض رفع فرمادیں گے کہ فلاں فلاں امور "شیٔ" میں داخل ہیں اور فلاں فلاں اس سے خارج۔ یہ اعتراض تو خان صاحب کے ترجمہ پر ہے جس میں "شیٔ" یا "چیز" کا لفظ ہی سرے سے موجود نہیں ہے وہ تو بالکل صاف ترجمہ فرما رہے ہیں کہ "اللہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ احمد رضا خان صاحب سے "غفلت و بے توجہی" کے باعث "شیٔ" کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے کیونکہ "مسئلہ عموم قدرت" کو "امکان کذب" کے خوفناک اور بھیانک عنوان سے اٹھانے کا بڑی حد تک سہرا احمد رضا خان صاحب کے سر ہے اور اس آخری دور میں وہی اس کے سب سے بڑے علم بردار رہے ہیں۔ اس مسئلہ پر انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں وہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں اور "شیٔ" کی حقیقت وغیرہ سے کیسے ناآشنا ہو سکتے ہیں۔ ان شواہد کی

روشنی میں ہمارا تو پختہ خیال ہے کہ یہ ترجمہ کسی غلط فہمی یا غفلت و بے توجہی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا باعث ان کا وہی نظریہ اور عقیدہ ہے جو انہوں نے مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے یا پھر مولانا اسمٰعیل شہید نور اللہ مرقدہ کی کرامت ہے کہ ان پر بہتان باندھنے والا اور الزام تراشی کرنے والا خود اسی الزام کا شکار ہوگیا اور "چاہ کن را چاہ درپیش" کا عملی مصداق۔ اور اس جرم کا شکار بھی احمد رضا خان صاحب اس انداز سے ہوئے ہیں کہ مراد آبادی صاحب اپنی ساری کوشش صرف کر دینے کے باوجود ان کی برات ثابت نہ کرسکے۔

سچ ہے ؎ ولن یصلح العطار ما افسده الدهر

بہرحال ان تمام نقائص سے منزہ اور پاک ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی

"قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی آنکھیں جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے کان اور آنکھیں بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

نوٹ: احمد رضا خان صاحب اپنے ترجمہ میں قرآنی ترتیب کا بالکل خیال نہیں رکھتے اور ہم بارہا اس پر تنبیہ کرچکے ہیں لیکن ہر آیت کے ذیل میں اس پر تنبیہ کرنے سے چونکہ طوالت کا خطرہ تھا اس لیے گزشتہ چند آیتوں کے ذیل میں ہم نے اس پر تنبیہ نہیں کی اور اب آئندہ بھی بلا ضرورت ہم اس کا ذکر نہیں کریں گے۔ قارئین کرام معمولی توجہ سے اس سقم کو خود ہی معلوم کرسکتے ہیں۔

آیت (۲۱) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

اس کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے یہ کیا ہے۔

"اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے"

اس ترجمہ میں متعدد سقم پائے جاتے ہیں۔

اولاً:- اللہ تعالیٰ کی "عبادت" کا ترجمہ "پوجنے" سے کرنے کے متعلق سورۂ فاتحہ کی آیت (۴) کے ذیل میں ہم عرض کرچکے ہیں مکرر ملاحظہ فرمالیا جائے۔

ثانیاً:- "اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے "تم سے اگلوں کو" اردو میں "اگلا" کا لفظ جس طرح "گزشتہ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح "آئندہ" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ملاحظہ ہو اردو فیروز اللغات وغیرہ اور ظاہر ہے کہ اس دوسرے معنی کا مراد خداوندی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ سے اس خلاف مقصود معنی کا ایہام ہو رہا ہے۔ اس نقص سے بالکل پاک ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے وہ فرماتے ہیں "جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے"۔

ثالثاً:- احمد رضا خان صاحب نے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" کا ترجمہ کیا ہے "یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے" کلمہ "لعلّ" اصل میں "ترجی" یعنی امید دلانے کے لیے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ "امید" میں غیر یقینی کیفیت ہوتی ہے جو قطعی علم نہ ہونے کے باعث پیدا

ہوتی ہے اور چونکہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو ہر چیز کا علم قطعی و یقینی حاصل ہے اس لیے اس لفظ کا استعمال اس مقام پر کیسے صحیح ہوگا ؟ اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ محققین مفسرین نے اس جواب کو اختیار فرمایا ہے کہ اس مقام پر یہ لفظ امید کی بجائے یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی اس کا ترجمہ "تاکہ" ہوگا نہ کہ "امید کرتے ہوئے"۔ [۱]

اس کے برعکس تفسیر کبیر و نیشاپوری علی ہامش الطبری اور قرطبی [۲] وغیرہ میں اس جواب کے ساتھ ساتھ "ترجی" یعنی امید والے معنی کو صحیح بنانے کے لیے بھی تاویل ذکر کی گئی ہے۔ اور بعض مفسرین کا یہ ذکر کرنا کہ "لَعَلَّ" "کَیْ" یعنی "تاکہ" کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، یہ بات اولاً تو اس لیے صحیح نہیں ہے کہ تفسیر قرطبی اور روح المعانی وغیرہ میں باقاعدہ اشعار عرب کے حوالہ سے "لَعَلَّ" کا اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور ثانیاً اس لیے کہ معترضین نے "لعل" کے اس معنی میں استعمال ہونے کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس کا صحیح مطلب کشاف [۳] و حاشیہ سیّد شریف علی الکشاف [۴] میں ذکر کیا گیا ہے۔ سیّد شریف جرجانی کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

بل ارادوا ان ما بعدھا اذا صدرت علی (ترجمہ) ("لعل" کے "کَیْ" کے معنی میں استعمال ہونے سے)

[۱] ملاحظہ ہو جلالین ص ۶، روح البیان ص ۷۵ ج ۱، خازن ص ۳۸ ج ۱، معالم التنزیل برحاشیہ خازن ص ۳۸ ج ۱، مراح لبید ص ۷ ج ۱، الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز برحاشیہ مراح لبید ص ۷ ج ۱، تفسیر نسفی ص ۲۹ ج ۱، اکلیل علی مدارک التنزیل ص ۱۰۵ ج ۱، کشاف ص ۲۹ ج ۱، روح المعانی ص ۱۸۶ ج ۱، طبری ص ۱۲۵ ج ۱۔

[۲] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص ۱۰۰ ج ۲، نیشاپوری علی ہامش الطبری ص ۱۷۳ ج ۱، قرطبی ص ۲۲۷ ج ۱

[۳] کشاف ص ۲۲۶ ج ۱، [۴] حاشیہ سید شریف علی الکشاف ص ۲۳۰ ج ۱۔

سبیل الاطماع من الکریم متحقق عقیب ما قبلھا کتحقق الغایۃ عقیب ما ھی سبب لہ فکانھا بمعنی کئی۔

(حاشیہ سید شریف المطبوعہ مع الکشاف ص ۲۳۰ ج ۱)

ان کی مراد یہ ہے کہ (لَعَلَّ) جب کریم سے صادر ہو، طمع دلانے کے طور پر تو "لَعَلَّ" کا مابعد اپنے ماقبل کے بعد یقیناً پایا جائے گا مثل پائے جانے "غایت" کے اس چیز کے بعد جس کی وہ "غایت" ہے تو گویا "لَعَلَّ" "کَیْ" کے معنی میں ہوگیا۔

بہرحال خان صاحب کا ترجمہ ایک ضعیف اور مرجوح قول پر مبنی ہے اور اس کی مرجوحیت کی تصریح روح المعانی [۱] وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے جب کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ "تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ" جمہور مفسرین کے راجح قول کے مطابق ہے۔

رابعاً :۔ "تَتَّقُوْنَ" کا فاعل "جمع مذکر حاضر" کی ضمیر ہے لیکن احمد رضا خان صاحب اس ضمیر فاعل کو "مفعول" کی صورت میں پیش کر رہے ہیں ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو "تمہیں پرہیزگاری ملے" اس ترجمہ میں "تمہیں" بمعنی "تمکو"، ضمیر مفعول ہے۔ "فاعلی ضمیر" کا ترجمہ اردو میں "فاعلی ضمیر" کی صورت میں وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "تم پرہیزگار بن جاؤ"۔ اس آیت کا ان نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "اے

[۱] روح المعانی ص ۱۸۶ ج ۱۔

لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

آیت (۲۲) اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب اس آیت کا ترجمہ فرماتے ہیں۔

"اور جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔"

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً :- اس آیت کے شروع میں حرف عطف "و" نہیں ہے لیکن احمد رضا خان صاحب نے ترجمہ میں اپنی طرف سے "اور" کا لفظ داخل کر دیا ہے۔ جو حرف عطف واؤ کا ترجمہ ہے۔

ثانیاً :- احمد رضا خان صاحب نے "بِنَآءً" کا ترجمہ "عمارت" کیا ہے حالانکہ "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" یعنی قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کی تفسیر کرتا ہے، کے ماتحت اگر موصوف قرآن پاک ہی کی دیگر آیات میں اس کی تفسیر ڈھونڈتے تو یہ آیت شریفہ اس کی وضاحت کر دیتی۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا [1] (ترجمہ خانصاحب) اور ہم نے آسمان کو چھت بنایا نگاہ رکھی گئی

[1] الانبیاء : ۳۲

اس موقعہ پر تقریباً سب ہی مفسرین نے "بناء" سے چھت مراد لی ہے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر [1]، تبصیر الرحمان، فتح القدیر، الدر المنثور، تفسیر ابن عباس برحاشیہ الدر المنثور، البحر المحیط، تفسیر کبیر وغیرہ بلکہ "بناء" کی یہ تفسیر عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے مثلاً ملاحظہ ہو الدر المنثور و روح المعانی [2] وغیرہ۔ خان صاحب کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور مفسرین کی ذکر کردہ تفسیر کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں "جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت"

ثالثاً :- "مِنَ الثَّمَرٰتِ" میں لفظ "مِنْ" کے بارے میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ "مِنْ" "تبعیضیہ" بھی بنایا جا سکتا ہے اور "بیانیہ" بھی خان صاحب نے اس کو "تبعیضیہ" قرار دے کر ترجمہ کیا ہے چنانچہ ان کے ترجمہ "کچھ پھل نکالے" میں لفظ "کچھ" "من" تبعیضیہ ہی کا ترجمہ ہے اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے اس کو "بیانیہ" قرار دے کر ترجمہ فرمایا ہے۔ چونکہ مفسرین کرام نے دونوں ہی صورتوں کو جائز قرار دیا ہے اس لیے ہم "مِنْ" کو تبعیضیہ قرار دینے کے باعث تو خان صاحب پر اعتراض نہیں کرتے لیکن "مِنْ" کو تبعیضیہ قرار دینے کی صورت میں مفسرین کرام نے اس آیت کی جو "ترکیب" ذکر فرمائی تھی افسوس ہے کہ خان صاحب اپنے ترجمہ میں اس کو بالکل ملحوظ نہ رکھ سکے چنانچہ صاحب

[1] ابن کثیر ص ۵۸ ج ۱، تبصیر الرحمان ص ۳۶ ج ۱، فتح القدیر ص ۳۸ ج ۱، الدر المنثور ص ۳۴ ج ۱، تفسیر ابن عباس برحاشیہ الدر المنثور ص ۱۳ ج ۱، البحر المحیط ص ۹۸ ج ۱، تفسیر کبیر ص ۱۰۹ ج ۲

[2] روح المعانی ص ۱۸۸ ج ۱ ۔

روح المعانی ''من'' کو تبعیضیہ قرار دینے کی صورت میں ''ترکیب'' کی رابع صورت کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

و''من'' الثانیۃ اما للتبعیض اذکم من ثمرۃ لم تخرج بعد۔ فرزقا حینئذٍ بالمعنی المصدری مفعول لہ۔ لاخرج۔ و (لکم) ظرف لغو مفعول بہ لرزق ای اخرج شیئا (من الثمرات) ای بعضھا لاجل انہ رزقکم۔ [لہ]

(ترجمہ) اور دوسرا ''من'' تبعیض کے لیے ہے کیونکہ کتنے ہی پھل ہیں جو اب تک پیدا نہیں ہوئے۔ پس ''رزقا'' اس وقت مصدری معنی کے ساتھ ''اخرج'' کا مفعول لہ ہوگا۔ اور ''لکم'' ظرف لغو مفعول بہ ہے ''رزقا'' کا۔ یعنی کچھ پھل اللہ نے پیدا کئے اس لیے کہ اس نے یہ تم کو دیئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس صورت میں ''رزقا'' مفعول لہ ہوگا ''اخرج'' کا اور ''نحو'' کا مسئلہ ہے کہ ''مفعول لہ'' اور فعل معلل بہٖ کا فاعل ایک ہوتا ہے جیسے ''ضربتہ تادیبا'' میں ''تادیب'' اور ''ضرب'' کا فاعل ایک ہے۔ اسی طرح اس ترکیب کے مطابق یہاں پر ''اخرج'' اور ''رزقا'' کا فاعل بھی ایک ہوگا۔ اور چونکہ ''اخرج'' کا فاعل یہاں پر وہ ضمیر ہے جو ''رب'' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے اس لیے ''رزقا'' کا فاعل بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوں گے حالانکہ احمد رضا

لہ روح المعانی ص ۱۸۸ ج ۱۔

خان صاحب ''رزقا'' کا فاعل لوگوں کو قرار دے رہے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو'' کیونکہ کھانے کا فاعل اللہ تعالیٰ کو تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال احمد رضا خان صاحب نے ''من'' کے ''تبعیضیہ'' ہونے کو اختیار تو فرما لیا لیکن ترجمہ میں وہ اس کے فنی تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ''من'' کو ''بیانیہ'' قرار دے کر بالکل عام فہم ترجمہ کر دیا اور کوئی فنی نقص بھی پیدا نہ ہوا چنانچہ وہ فرماتے ہیں ''پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے کے واسطے''۔

رابعاً:- ''فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'' کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے فرمایا ہے۔ ''تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ''۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً اور جان بوجھ کر شرک نہیں کرنا چاہیئے غفلت اور لاعلمی میں شرک و کفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ''وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'' کا جملہ اس لیے بڑھایا تھا کہ قصداً اور جانتے ہوئے شرک کرنے کی شناعت مزید واضح ہو جائے اور احمد رضا خان صاحب نے لاعلمی اور غفلت کے شرک و کفر کی اجازت اس سے نکال لی جیسا کہ ان کے اس ترجمہ سے مترشح ہو رہا ہے کہ ''جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ''۔ اس غلط ایہام سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ بالکل پاک ہے وہ فرماتے ہیں۔ ''سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو''۔ یعنی اللہ کا مقابل و شریک تو کسی حالت میں نہیں بنانا چاہیئے اور تم تو جانتے بھی ہو اس لیے تمہیں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ احتیاط کرنی چاہیئے۔

ہے کہ یہ "فعل مضارع مجہول" کا صیغہ ہے لیکن احمد رضا خان صاحب "مضارع معروف" والا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "پلٹ کر جاؤ گے"۔ اللہ تعالیٰ کے مجہول کا صیغہ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ تھا کہ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیّت کے ماتحت ہوگا۔ اس میں بندہ کے اختیار و ارادہ کو قطعاً کوئی دخل نہ ہوگا لیکن احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ "فعل معروف" والا کر کے اس "ایہام" کے لیے راستہ ہموار کر دیا کہ شاید اس "پلٹ کر جانے" میں بندے کے اختیار و ارادہ کو بھی کچھ دخل ہو۔ بہر حال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ قاعدہ کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ ایہام سے بھی محفوظ ہے وہ فرماتے ہیں "پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔ بہر حال ان تمام نقائص سے منزہ اور پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی

"کس طرح کافر ہوتے ہو خدائے تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو پھر مارے گا تم کو پھر جلائے گا تم کو پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔

آیت (۲۹) هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○

اس آیت مبارکہ کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے کیا ہے۔

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف استوا (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محل نظر ہے۔

اولاً:- احمد رضا خان صاحب نے "خَلَقَ" کا ترجمہ "بنانا" کیا ہے حالانکہ عربی زبان سے کچھ بھی شناسائی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ "خَلَقَ" کے معنی محض "بنانے" کے نہیں ہوتے بلکہ "پیدا کرنے" کے ہوتے ہیں اور ہر شخص "پیدا کرنے" اور محض "بنانے" کے فرق سے بھی بخوبی آگاہ ہے اس کا صحیح ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے"۔

ثانیاً:- مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ "جَمِيعًا" کلمہ "مَا" کے عموم کی تاکید کے لیے ہے ملاحظہ ہو روح المعانی[1] لیکن احمد رضا خان صاحب اس تاکیدی کلمہ کا ترجمہ ہی چھوڑ گئے ہیں جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے پاک ہے وہ فرماتے ہیں "پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب" اس ترجمہ میں لفظ "سب"، "جَمِيعًا" ہی کا ترجمہ ہے۔

ثالثاً:- احمد رضا خان صاحب "فَسَوَّاهُنَّ" کی ضمیر مفعول کا ترجمہ ترک کر گئے ہیں وہ لکھتے ہیں "تو ٹھیک سات آسمان بنائے"، جبکہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کے ترجمہ میں اس ضمیر مفعول کا ترجمہ بھی ترک نہیں ہوا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان"، اس ترجمہ میں لفظ "ان کو"، ضمیر مفعول ہی کا ترجمہ ہے جسے خان صاحب ترک کر گئے تھے۔

رابعاً:- آسمانوں کو ٹھیک کرنے سے مراد وہی ہے جو سورۂ ملک میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے یعنی

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ (ترجمہ خان صاحب) جس نے سات

[1] روح المعانی ص ۲۱۵ ج ۱ -

سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۝[1]

آسمان بنائے ایک کے اوپر دوسرا۔ تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے۔ تو نگاہ اٹھا کر دیکھ، تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔ پھر دوبارہ نگاہ اٹھا۔ نظر تیری طرف ناکام پلٹ آئے گی تھکی ماندی۔

گویا آسمانوں کو ٹھیک کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں کسی قسم کی کجی، ٹیڑھا پن اور کوئی فطور نہیں ہے لیکن احمد رضا خان صاحب نے جو ترجمہ فرمایا ہے اس کا مطلب بنتا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے ٹھیک سات آسمان بنا ڈالے نہ کم نہ زیادہ حالانکہ اس کا مرادِ خداوندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو "تو ٹھیک سات آسمان بنائے"۔ جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ صاف واضح اور مراد خداوندی کو نمایاں کرنے والا ہے وہ فرماتے ہیں "ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان"۔

خامساً:- "هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ"، "جملہ اسمیہ" ہے جبکہ احمد رضا خان صاحب "جملہ فعلیہ" ـــ یَعْلَمُ كُلَّ شَیْءٍ ـــ کا ترجمہ کر رہے ہیں یعنی "وہ سب کچھ جانتا ہے"۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے وہ "جملہ اسمیہ" کا ترجمہ "جملہ اسمیہ" ہی سے فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں "خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے"۔

[1] سورۃ الملک: ۳، ۴

سادساً:- "بِكُلِّ شَیْءٍ" میں آنے والے حرف جر "با" کا ترجمہ خان صاحب ترک کر گئے ہیں کیونکہ وہ لکھتے ہیں۔ "وہ سب کچھ جانتا ہے" جبکہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ "حرف جر" "بار" کا ترجمہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ "خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے" اس ترجمہ میں لفظ "سے" حرف جر "با" ہی کا ترجمہ ہے جسے احمد رضا خان صاحب چھوڑ گئے تھے۔ خان صاحب کے ترجمہ میں پائے جانے والے تمام نقائص سے منزہ اور پاک ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے وہ فرماتے ہیں۔

"وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے"۔

آیت (۳۰) وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

"اور یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ بولا کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے"۔

اس ترجمہ میں متعدد وجوہ سے سقم پایا جاتا ہے۔

اولاً :- " رَبُّكَ " میں " مضاف الیہ " واقع ہونے والی ضمیر " واحد مذکر حاضر " کی ہے لیکن احمد رضا خان صاحب ترجمہ " جمع حاضر " والا کر رہے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں " جب تمہارے رب نے "۔ جبکہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اصل کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے یعنی " جب کہا تیرے رب نے "۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ تغیر ادب کی خاطر کیا ہے تو عرض ہے کہ پھر سب جگہ ایسا ہی ترجمہ کرنا چاہیئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خان صاحب اس کی بھی پابندی نہیں کرتے مثلاً ابھی چند آیات پیشتر آیت (۲۵) کے اندر آنے والے لفظ " وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا " کا ترجمہ خان صاحب نے واحد ہی کی ضمیر سے کیا ہے، ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو " اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے "۔ حالانکہ اس میں خطاب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے۔ بہرحال اصل کے مطابق ترجمہ کرنا اور ترجمہ میں بلا ضرورت تغیر کرنے سے اجتناب کرنا ہی اولیٰ ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا دستور و معمول ہے۔

ثانیاً :- " اِنِّیْ جَاعِلٌ " " قَالَ رَبُّكَ " کا " بیان " ہے اور اردو میں بیان سے پہلے " کاف بیانیہ " یعنی " کہ " لایا جاتا ہے اور بقول مولانا محمد حسین آزاد " اس کے بغیر کلام بے مزہ ہو جاتا ہے "۔ ؎1

احمد رضا خان صاحب نے اس موقعہ پر " کاف بیانیہ " کو حذف کر کے کلام کو " بے مزہ " اور پھیکا کر دیا ہے جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے وہ فرماتے ہیں۔

" جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب "۔

؎1 مصباح القواعد ص ۵۳ ج ۲ ۔

ثالثاً :- احمد رضا خان صاحب نے ترجمہ میں " اپنا " کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں " میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں " حالانکہ متن قرآن میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ " اپنا " ہو۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ زائد از ضرورت الفاظ کے سقم سے منزہ اور پاک ہے بلکہ " تنوین تنکیر " کے ترجمہ پر بھی مشتمل ہے وہ فرماتے ہیں " میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب "۔

رابعاً :- " فِیْهَا " کا لفظ دو مرتبہ آرہا ہے جب کہ احمد رضا خان صاحب نے ایک کا ترجمہ کیا ہے اور دوسرے کا ترجمہ ترک کر دیا ہے اور چونکہ دونوں کا تعلق علیحدہ علیحدہ فعل سے ہے یعنی پہلے کا تعلق " تَجْعَلُ " سے اور دوسرے کا تعلق " یُفْسِدُ " سے ہے اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ علیحدہ علیحدہ ترجمہ کرنے کی بجائے " عطف " سے کام لیا ہے موصوف کا ترجمہ ملاحظہ ہو " کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا "۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے پاک ہے وہ دونوں کا ترجمہ علیحدہ علیحدہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں " کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے "۔

خامساً :- مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ " نُسَبِّحُ " اور " نُقَدِّسُ " مضارع کے صیغے ہیں اور یہ یہاں پر دوام و استمرار پر دلالت کرنے کے لیے لائے گئے ہیں ملاحظہ ہو روح المعانی ؎1 حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے اس دوام و استمرار کو اپنے ترجمہ میں واضح کر دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں " اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو "۔ اس ترجمہ میں " پڑھتے رہتے

؎1 روح المعانی ص ۲۲۲ ج ۱ ۔

ہیں" اردو کے اندر استمرار کے معنی پر دلالت کرتا ہے اور چونکہ "یاد کرتے ہیں" کو پہلے جملہ پر عطف کیا گیا ہے اس لیے اس میں بھی استمرار کے معنی مفہوم ہو جاتے ہیں جب کہ احمد رضا خان صاحب اس میں پائے جانے والے دوام و استمرار سے بالکل بے خبر ہو کر یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ "اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں"۔

سادساً:۔ "نُقَدِّسُ لَكَ" کا ترجمہ خان صاحب نے "پاکی بولنے" سے کیا ہے "پاکی بولنا" ایسے الفاظ آج کل متروک ہو چکے ہیں اور ان کا آج کل استعمال فصاحت کو بٹہ لگانے کے مترادف ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے۔

سابعاً:۔ "نُسَبِّحُ" کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے "تسبیح کرنے" سے کیا ہے۔ اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں سب سے راجح اور بروایت مسلم وغیرہ حدیث مرفوع سے ثابت یہ ہے کہ ملائکہ کی تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ" پڑھنا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر[1] اور جب متعین الفاظ تسبیح کے مسلم شریف وغیرہ کی حدیث مرفوع سے ثابت ہو گئے تو پھر "نُسَبِّحُ" کا ترجمہ "تسبیح کرنے" کی بجائے "پڑھنا" زیادہ موزوں اور بہتر ہو گا جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں "اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں"۔

نوٹ:۔ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ سورۃ فاتحہ کے آغاز میں "حمد" کا ترجمہ "خوبی" کرنے کو مرجوح قرار دیا گیا تھا اور یہاں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے بھی "حمد" کے معنی "خوبی" کیے ہیں، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت

[1] ابن کثیر ج ۱ ص ۷۳

شیخ الہند رحمہ اللہ نے "حمد" کا ترجمہ صرف "خوبی" نہیں کیا بلکہ "خوبی پڑھنا" کیا ہے اور "خوبی پڑھنا" "خوبی بیان کرنے" کے معنی میں ہے اور "خوبی بیان کرنا" تعریف کرنے کا مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی معنی کے ایک مقام پر مرجوح ہونے کا یہ لازمی مطلب نہیں کہ وہ معنی ہر مقام پر مرجوح ہوں۔ جہاں "حقیقی معنی" بلا تکلف بن سکتے ہوں وہاں "مجازی معنی" مراد لینا یقیناً مرجوح ہو گا لیکن جہاں "حقیقی معنی" نہ بن سکتے ہوں یا قرائن "مجازی معنی" کو متعین کر رہے ہوں تو ایسے مقام پر "مجازی معنی" ہی راجح قرار پائیں گے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیئے تاکہ اس قسم کے ظاہری اختلافات دیکھ کر پریشانی نہ ہو۔

ثامناً:۔ "إِنِّي أَعْلَمُ" میں حرف تحقیق "إِنَّ" کا ترجمہ خان صاحب چھوڑ گئے ہیں وہ لکھتے ہیں "فرمایا مجھے معلوم ہے" جب کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے اس کا ترجمہ نظر انداز نہیں فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "فرمایا بیشک مجھ کو معلوم ہے" اس میں "بیشک" کا لفظ حرف تحقیق "إِنَّ" ہی کا ترجمہ ہے جسے احمد رضا خان صاحب ترجمہ کرتے وقت چھوڑ گئے تھے۔ بہر حال ان تمام نقائص سے منزہ اور پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو۔ فرمایا بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے"۔

آیت (۳۱) وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ

عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔

" اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھاتے پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کرکے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ۔"

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً:- "عَرَضَهُمْ" میں "عَرَضَ" ماضی معروف کا صیغہ ہے جس کا معنی "پیش کیا" "سامنے کیا" ہوگا۔ احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ "پیش کرکے" کیا ہے جو "ماضی کا ترجمہ ہونے کی حیثیت سے غلط ہے اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے "ماضی معروف" کا بالکل صحیح ترجمہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں "پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو۔"

ثانیاً:- فَقَالَ" میں "فا" کا ترجمہ خان صاحب نے چھوڑ دیا ہے اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ "فا" کا ترجمہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ "پھر فرمایا" یہ "پھر" "فا" ہی کا ترجمہ ہے جسے خان صاحب ترک کر گئے ہیں۔

ثالثاً:- "اَنْبِئُوْنِیْ" میں ضمیر مفعول "یائے متکلم" کا ترجمہ خان صاحب چھوڑ گئے ہیں جب کہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ اس ضمیر مفعول کا ترجمہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں "پھر فرمایا بتاؤ مجھ کو" اس میں "مجھ کو" اسی ضمیر مفعول "یائے متکلم" کا ترجمہ ہے جسے خان صاحب ترجمہ میں نظر انداز کر گئے ہیں۔

رابعاً:- "اِنْ كُنْتُمْ" کے ترجمہ میں خان صاحب حرف شرط "اِنْ" اور "كُنْتُمْ" کی ضمیر فاعلی کا ترجمہ ترک کر گئے ہیں اس کے برعکس حضرت شیخ الہند

قدس سرہ اپنے ترجمہ میں ان امور کا لحاظ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ "بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو"۔ اس ترجمہ میں لفظ "اگر" حرف شرط "ان" اور لفظ "تم"، "كُنْتُمْ" کی ضمیر فاعلی ہی کا ترجمہ ہے جسے احمد رضا خان صاحب چھوڑ گئے تھے۔ بہرحال ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا ہے یعنی "اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو فرشتوں کے۔ پھر فرمایا بتاؤ مجھ کو نام انکے اگر تم سچے ہو"۔

آیت (۳۲) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔

" بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً:- احمد رضا خان صاحب نے "سُبْحٰنَكَ" کا ترجمہ کیا ہے "پاکی ہے تجھے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب نے "سُبْحَان" کو مفعول کی طرف مضاف مانا ہے جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے "پاک ہے تو" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو فاعل کی طرف مضاف مانا ہے کیونکہ "تجھے" اردو میں ضمیر مفعول ہے اور "تو" ضمیر فاعل ہے۔ مفسرین کی تصریح کے مطابق ترکیب کے لحاظ سے یہ دونوں صورتیں یہاں بن سکتی ہیں ملاحظہ ہو روح المعانی[1] لیکن حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ

[1] روح المعانی ص ٢٢٦ ج ١ ۔

کی اختیار کردہ ترکیب بعض وجوہ سے راجح ہے کیونکہ جب ائمہ لغت کی تصریح ملتی ہے کہ "سبحان"، "سبح"، ثلاثی مجرد کا مصدر ہے تو بلا وجہ اس کو اس موقعہ پر "اسم مصدر" یا "علم مصدر" قرار دینا بہرحال مرجوح ہوگا۔ نیز مجرد مان کر بمعنی "تنزیہ" لینا اور پھر اعتراض اور اس کے جواب میں پڑنے سے بہرحال بہتر ہے کہ اسے "براءۃ" کے معنی میں لے کر فاعل کی طرف مضاف مان لیا جائے۔ "سبحان" سے متعلق یہ چند باتیں انتہائی ایجاز و اختصار سے راقم الحروف نے عرض کی ہیں۔ تفصیل کے لیے کتب تفاسیر کے علاوہ منطق کی مشہور درسی کتاب "سلم العلوم" کے شروح و حواشی خصوصاً مولانا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ کی "شرح قاضی مبارک" کا مطالعہ کر لیا جائے کیونکہ "سلم العلوم" کی ابتدا ہی لفظ "سبحانہ" سے ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے متعلق تحقیقات "سلم" کے شروح و حواشی میں بھی ذکر ہو گئی ہیں۔

ثانیاً:- "اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ" کے درمیان قرآن پاک میں حرف عطف نہیں ہے اس کی رعایت فرماتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان دونوں کے ترجموں کے درمیان بھی حرف عطف استعمال نہیں فرمایا جبکہ احمد رضا خان صاحب اپنے ترجمہ میں اس کی رعایت نہ کر سکے چنانچہ خان صاحب ترجمہ کرتے ہیں "تو ہی علم و حکمت والا ہے" احمد رضا خان صاحب نے حرف عطف "و"، کو ترجمہ میں داخل کر دیا حالانکہ قرآن پاک میں حرف عطف نہیں ہے اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ قرآن پاک کے بالکل مطابق ہے وہ فرماتے ہیں "تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا"۔

ثالثاً:- احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ "تو ہی علم و حکمت والا ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے پاس "علم و حکمت" بالکل نہیں

ہے کیونکہ خان صاحب پورے حصر کے ساتھ رقمطراز ہیں "تو ہی علم و حکمت والا ہے" حالانکہ یہ بات قرآن پاک ہی کی دیگر آیات کے بالکل خلاف ہے خانصاحب نے یہ ترجمہ تو کر دیا لیکن اس ترجمہ پر پڑنے والے اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی دور رس نگاہ نے اس اعتراض کو بھانپ لیا اس لیے اس اعتراض کو رفع کرنے کا سامان بھی ساتھ ہی کر دیا چنانچہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں "بے شک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا"۔ موصوف نے لفظ "اصل" ترجمہ میں بڑھا کر مرادِ خداوندی کو واضح کرتے ہوئے اعتراض کو رفع فرما دیا کہ اصل جاننے والا اور اصل حکمت والا یعنی ذاتی علم و حکمت رکھنے والے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور یہ حصر "علم ذاتی" کے اعتبار سے ہے۔ دوسروں کا علم عطائی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے دے دیا مل گیا اور اگر نہ دیا تو نہ ملا۔ اور یہی بات فرشتے کہنا چاہتے تھے۔ بہرحال ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے یعنی "بولے پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تو نے ہم کو سکھایا بے شک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا"

(آیت ۳۳) قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ
فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ
وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔

"فرمایا اے آدم بتا دے انہیں سب (اشیاء کے) نام جب اس نے (یعنی آدم نے) انہیں سب کے نام بتا دئے۔ فرمایا میں نہ کہتا

تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں ۔ اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔"

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے ۔

اولاً :- احمد رضا خان صاحب " فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ " میں آنے والے حرف " فا " کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں " پھر جب بتا دیئے " اس میں لفظ " پھر " " فا " ہی کا ترجمہ ہے جسے خان صاحب ترک کر گئے ہیں ۔

ثانیاً :- " اَلَمۡ اَقُلۡ " کے شروع میں آنے والے " ہمزۂ استفہام " کا ترجمہ خان صاحب نظر انداز کر گئے ہیں اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ " استفہام " کا ترجمہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں " کیا نہ کہا تھا میں نے " اس میں لفظ " کیا " " ہمزۂ استفہام " ہی کا ترجمہ ہے جسے بریلوی ترجمہ میں ترک کر دیا گیا ہے ۔

ثالثاً :- " اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ " میں آنے والے لفظ " لَكُمۡ " کے ترجمہ سے خان صاحب پہلوتہی کر گئے ہیں جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے پاک ہے ۔ موصوف کا ترجمہ ملاحظہ ہو " کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو " اس میں لفظ " تم کو " " لكم " ہی کا ترجمہ ہے جس سے خان صاحب نظریں بچا کر نکل گئے تھے ۔

رابعاً :- چونکہ " اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ " میں علم یقینی مراد تھا اس لیے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے ترجمہ میں اس کو واضح کر دیا چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ " میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی " جبکہ احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ اس خوبی سے عاری ہے ۔ ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ہے یعنی

" فرمایا اے آدم بتا دے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام پھر جب بتا دیئے اس نے ان کے نام ۔ فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔"

آیت (۳۴) وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۔

اس آیت مبارکہ کا ترجمہ خان صاحب نے یہ کیا ہے ۔

" اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔"

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے ۔

اولاً :- احمد رضا خان صاحب نے " فَسَجَدُوۡا " کا ترجمہ کیا ہے " تو سب نے سجدہ کیا " لیکن اس ترجمہ میں یہ سقم پایا جاتا ہے کہ " فا " جس " تعقیب مع الوصل " پر دلالت کرتی تھی اور جس سے معلوم ہوتا تھا کہ فرشتوں نے بلا کسی تاخیر و تعویق کے فوراً تعمیل حکم میں سر سجدہ میں ڈال دیا ملاحظہ ہو تفسیر ابو السعود[1] ۔ خان صاحب کے ترجمہ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی ۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ " فا " سے سمجھے جانے والے اس مفہوم کو بھی نمایاں کر رہا ہے وہ فرماتے ہیں " تو سب سجدہ میں گر پڑے " یہ " گر پڑنے " کا لفظ تعمیل حکم میں سرعت و جلدی پر دلالت کر رہا ہے جو حرف " فا " کا مفہوم ہے جبکہ خان صاحب کا ترجمہ " فا " کے اس مفہوم کو نمایاں کرنے سے قاصر ہے ۔

[1] تفسیر ابو السعود ص ۲۱۴

ثانیاً:- " اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ" جملہ مستانفہ ہے جو سوال مقدر کا جواب ہوا کرتا ہے ملاحظہ ہو روح المعانی[1] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ احمد رضا خان صاحب کو یہ معلوم ہی نہیں کہ یہ " جملہ مستانفہ" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کے ترجمہ سے پہلے لفظ " کہ" داخل کر کے " اِبْلِیْس" کے ساتھ اس جملہ کو ترکیب کے لحاظ سے متعلق کر دیا گویا یہ جملہ " ترکیب" کے لحاظ سے " ابلیس" کی صفت وغیرہ ہے ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو " سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا" جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمہ میں یہ سقم نہیں پایا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں " سب سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان۔ اس نے نہ مانا اور تکبر کیا" حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمہ سے اس کا " جملہ مستانفہ" ہونا نمایاں رہتا ہے۔

ثالثاً:- " کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ" میں " کَانَ" کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ " کَانَ" اپنے اصل معنیٰ میں ہے دوسرا یہ کہ " صَارَ" کے معنی میں ہے۔ پہلا قول راجح ہے کیونکہ اگر یہ " صَارَ" کے معنی میں ہوتا تو اس پہ ظاہر ہے کہ " فا" آنی چاہیئے تھی اور " وَکَانَ" کی بجائے " فَکَانَ" ہونا چاہیئے تھا۔ ملاحظہ ہو روح المعانی[2]۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ اسی راجح قول پر مبنی ہے جب کہ خان صاحب کے ترجمہ کی اساس ایک مرجوح قول پر ہے۔ ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا ہے یعنی

" اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان۔ اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں کا"

آیت (۳۵) وَقُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ

۱۔ روح المعانی ص ۲۳۱ ج ۱ ۲۔ روح المعانی ص ۲۳۱ ج ۱

وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

احمد رضا خان صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

" اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اوّلاً:- " یٰاٰدَمُ اسْکُنْ" کا ترجمہ احمد رضا خان صاحب نے " اے آدم .... رہو" محض " رہو" کے الفاظ سے جنت کو مستقل مسکن بنا لینا نہیں سمجھا جاتا حالانکہ یہاں پر مراد مستقل مسکن بنا لینا ہے چنانچہ روح المعانی میں ہے۔

(اُسْکُنْ) امر من السکنی بمعنی اتخاذ المسکن[1]

اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ جنت کو مستقل مسکن بنا لینے کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے وہ فرماتے ہیں " اے آدم! رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں" اس ترجمہ میں " رہا کر" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جنت کو مستقل مسکن بنا لینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

ثانیاً:- " اَلْجَنَّۃَ" سے کون سی جنت مراد ہے اس میں اختلاف ہے جمہور اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ وہی جنت مراد ہے جو صلحاء اور مؤمنین کو بطور ثواب مرحمت فرمائی جائے گی۔ جب کہ " معتزلہ" وغیرہ کا مسلک ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی رہائش والی جنت اس معہود جنت کے علاوہ ہے

۱۔ روح المعانی ص ۲۳۲ ج ۱

احمد رضا خان صاحب نے اپنے ترجمہ میں "جنت"، کو مطلق نہیں رکھا بلکہ لفظ "اس" کے ساتھ اس کو مقید کر دیا ہے حالانکہ معتزلہ کے مقابلہ میں جمہور اہل سنت جنت کو کو مطلق ذکر کرنے ہی سے جنت معہودہ مراد ہونے پر استدلال کرتے ہیں اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ احمد رضا خان صاحب نے جمہور اہل سنت کا مسلک چھوڑ کر معتزلہ وغیرہ کا مسلک اختیار کر لیا ہے۔ احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ ملاحظہ ہو وہ فرماتے ہیں "اے آدم تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو"۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب بریلوی حضرت آدم علیہ السلام کی رہائش کے لیے عام اور معہود جنت کے علاوہ کوئی اور جنت مانتے ہیں جس کو وہ "اس جنت"، سے تعبیر کر رہے ہیں اور یہی "معتزلہ" اور "قدریہ" کا مسلک ہے ملاحظہ ہو روح البیان [1] بلکہ جن لوگوں نے تعیین جنت سے کف لسان کو احوط قرار دیا ہے مفسرین نے اس کی بھی تردید کی ہے ملاحظہ ہو حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی [2]

ثالثاً:۔ احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ "کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اجازت ہے جنت میں جس جگہ چاہیں بے روک ٹوک وہاں بیٹھ کر کھا سکتے ہیں رہی یہ بات کہ "شجرہ ممنوعہ" کے علاوہ اور کیا کیا کھا سکتے ہیں یا بلا قید جو چاہیں کھا سکتے ہیں۔ احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ اس کو واضح کرنے سے بالکل قاصر ہے حالانکہ یہ بات مراد خداوندی کے بالکل خلاف ہے کیونکہ مراد یہ نہیں ہے کہ حضرت آدم کو کھانے کی جگہ فراہم کی جا رہی ہے بلکہ مراد خداوندی یہ ہے کہ "شجرہ ممنوعہ" کے علاوہ ہر چیز جو چاہو جہاں سے چاہو کھا سکتے ہو۔ اگر خان صاحب سورۂ اعراف کی آیت (۱۹) کو ترجمہ کرتے وقت مدنظر رکھ لیتے تو نہیں یہ غلط فہمی نہیں ہوتی کیونکہ اس

۱؎ روح البیان ص۱۰۶ ج۱، ۲؎ حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص۱۳۶ ج۲

میں صاف آتا ہے "فَکُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا" اس آیت میں لفظ "مِنْ" کا اضافہ اس کو متعین کر دیتا ہے کہ مطلب یہ نہیں کہ "جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ" بلکہ مطلب یہ ہے کہ "جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ"۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے وہ فرماتے ہیں "اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو"۔

رابعاً:۔ "وَلَا تَقْرَبَا" کے ترجمہ میں خان صاحب حرف عطف "و" کا ترجمہ ترک کر گئے ہیں جب کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے بالکل پاک ہے وہ فرماتے ہیں "اور پاس مت جانا"، اس میں لفظ "اور" حرف عطف "و" ہی کا ترجمہ ہے۔

خامساً:۔ "مگر" کا لفظ خان صاحب نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ متن میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ "مگر" ہو۔

سادساً:۔ موصوف نے "حَیْثُ شِئْتُمَا" کا ترجمہ کیا ہے "جہاں تمہارا جی چاہے"۔ اس میں موصوف نے "تمہارا جی" کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں۔ متن قرآن پاک میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ہے جس کا مطلب "تمہارا جی" ہو۔ اس کا بالکل صحیح ترجمہ وہی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی "جہاں کہیں سے چاہو"۔

ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے یعنی،

"اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم"

آیت (۳۶) فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ٥

احمد رضا خان صاحب اس آیت مبارکہ کا ترجمہ فرماتے ہیں۔

"تو شیطان نے اس سے (یعنی جنت سے) انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے ناقص ہے۔

اولاً:۔ "فَاَزَلَّهُمَا" کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے "جنت سے انہیں لغزش دی" اور لغزش کے اصل معنی "پیر پھسلنے" کے ہوتے ہیں ملاحظہ ہو مفردات امام راغب بزیل مادہ "زل" اور ظاہر ہے کہ لغزش اور پھسلنے کے بعد پہلی جگہ پر پھسلنے والا باقی نہیں رہتا تو گویا جنت سے لغزش اور جنت سے پھسل جانے کے معنی جنت سے نکلنے کے ہو گئے اور دوسرے جملہ "فَاَخْرَجَهُمَا" کا ترجمہ بھی جنت سے نکلنا ہی کیا ہے چنانچہ خان صاحب لکھتے ہیں "اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا"۔ اب دیکھیئے کہ خان صاحب کے ترجمہ کے مطابق دونوں جملوں یعنی "فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ" اور "فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ" کا مطلب ایک ہی بن گیا۔ اب زیادہ سے زیادہ خان صاحب کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرا جملہ پہلے کی تاکید ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اولاً تو تاسیس" یعنی دوسرے جملہ کو پہلے جملہ سے مختلف معنی پر محمول کرنا بہر حال تاکید سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں پر دوسرے

جملہ "فَاَزَلَّهُمَا" کے شروع میں حرف "فا" ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دوسرے جملہ کا مضمون پہلے جملہ کے مضمون سے مؤخر ہے اس صورت میں دوسرا جملہ پہلے کی تاکید کیسے بن سکتا ہے۔ الا یہ کہ "فا" میں مجاز کا ارتکاب کیا جائے جو ظاہر ہے کہ بلاضرورت ہونے کے باعث اس قابل نہیں کہ اسے اختیار کیا جائے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس اشکال کے جواب سے بڑے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہوئے ہیں اور دونوں جملوں کے درمیان آنے والا حرف "فا" جو پہلے جملہ کے تقدم اور دوسرے جملہ کے تأخر کا تقاضا کرتا تھا اسے بھی پورے طور پہ انہوں نے ملحوظ رکھ کر ترجمہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔ "پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو"۔

اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سورۂ اعراف کے دوسرے رکوع کا مطالعہ ضروری ہے وہاں اس واقعہ کے متعلقہ اجزاء مرتب صورت میں مذکور ہیں پہلا مرحلہ "وسوسہ" کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ" سے تعبیر فرمایا ہے یہ درجہ حقیقتاً "ازلال" نہیں ہے البتہ "کوشش ازلال" سے اس کو تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ" یعنی شیطان نے دھوکہ سے ان کو اپنی طرف مائل کر لیا سے تعبیر فرمایا ہے یہ درجہ حقیقت "ازلال" ہے تیسرا مرحلہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ" یعنی درخت کھانے سے تعبیر فرمایا ہے چوتھا مرحلہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے "قَالَ اهْبِطُوْا" یعنی جنت سے نکلنے سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس تفصیل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب سمجھیئے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو "اِزْلَالِ شَیْطَان" سے تعبیر فرمایا ہے درحقیقت وہ دوسرا مرحلہ

ہے جس میں شیطان نظر ورائے میں تبدیلی پیدا کر کے ان کو درخت کھانے کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا گویا اس مقام پر نظر ورائے کی تبدیلی کو "زَلَّ" سے مجازاً تعبیر کیا گیا ہے اسی لیے ابوحیان رقمطراز ہیں۔

ازل من الزلل وھو عثور القدم یقال زلت قدمہ وزلت بہ النعل والزلل فی الرأی والنظر مجاز[1]

اور چونکہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا درخت کھانے پر آمادہ ہو جانا جنت سے نکلنے کی تمہید تھا اور اس کو جنت سے نکلنے سے بالکل وہی نسبت تھی جو جو کسی سخت گڑی ہوئی چیز کو اکھیڑنے کے وقت اس کے ہلنے کو اس کے نکلنے سے ہوتی ہے کیونکہ پہلے اس کو ہلایا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو نکال لیا جاتا ہے اس لیے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے "اَزَلَّ" کا ترجمہ "ہلانے" سے کیا ہے اور اس طرح اس اعتراض کو رفع فرما دیا جس کا شکار احمد رضا خان صاحب ہو گئے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ "اَزَلَّ" یہاں پر اپنے حقیقی معنی "لغزش قدم" میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ مجازی معنی "زلت رائے" میں استعمال ہوا ہے اور اس مجازی معنی کو حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے "ہلانے" سے تعبیر فرمایا ہے۔

ثانیاً:- "فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ" کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے "اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب نے "ما" موصولہ سے جنت مراد لی ہے حالانکہ مفسرین کے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ "ما" سے "نعیم وکرامت" مراد ہے ملاحظہ ہو بیضاوی شریف[2]، حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی، روح البیان،

---

[2] بیضاوی وحاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص ۱۳۸ ج ۲، روح البیان ص ۱۰۹ ج ۱، تبصیر الرحمان ص ۴۰ ج ۱

[1] تفسیر البحر المحیط ص ۱۵۹ ج ۱

(باقی اگلے صفحہ پر)

تبصیر الرحمان، خازن، معالم التنزیل برحاشیہ خازن، مظہری، تفسیر ابن عباس برحاشیہ درمنثور، البحر المحیط، النہر الماد برحاشیۃ البحر المحیط، مراح لبید، الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز برحاشیہ مراح لبید وجلالین وغیرہ[1] احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ کے برعکس حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے جمہور مفسرین کے راجح قول کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "پھر نکالا ان کو اس عزت وراحت سے کہ جس میں تھے"۔

ثالثاً:- جن مفسرین نے "ما" سے جنت مراد لی ہے گو یہ قول مرجوح ہے مگر تاہم یہ مبنی ہے اس صورت پر کہ "عَنْهَا" کی ضمیر کو "شَجَرَة" یعنی درخت کی طرف لوٹایا جائے ملاحظہ ہو روح المعانی[1]، حاشیہ الشہاب علی البیضاوی، مدارک التنزیل، کشاف، شیخ زادہ علی البیضاوی، لیکن احمد رضا خان صاحب نے "عَنْهَا" کی ضمیر بھی جنت کی طرف لوٹائی اور "ما" سے بھی جنت ہی مراد لی اور یہ گویا اجماع مفسرین کے خلاف ہے۔ یہ بات نہ راجح قول کے مطابق ہے اور نہ مرجوح قول کے موافق۔

رابعاً:- احمد رضا خان صاحب نے "فَاَخْرَجَهُمَا" میں آنے والے حرف "فا" کا ترجمہ "اور" کیا ہے۔ یہ ترجمہ "واؤ" کا ہوتا ہے نہ کہ "فا" کا۔ یہ بھی کسی مفسر نے نہیں لکھا کہ یہاں پر "فا" "واؤ" کے معنی

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابقہ:- خازن ص ۴۹ ج ۱، معالم التنزیل برحاشیہ خازن ص ۴۹ ج ۱، مظہری ص ۵۷ ج ۱، تفسیر ابن عباس برحاشیہ درمنثور ص ۱۹ ج ۱، بحر المحیط ص ۱۶۲ ج ۱، النہر الماد برحاشیہ البحر المحیط ص ۱۵۰ ج ۱، مراح لبید ص ۱ ج ۱، الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز ص ۱ ج ۱، جلالین ص ۸۔

[1] روح المعانی ص ۲۳۶ ج ۱، حاشیہ الشہاب ص ۱۳۸ ج ۲، مدارک التنزیل ص ۴۳ ج ۱، کشاف ص ۲۷۴ ج ۱، شیخ زادہ علی البیضاوی ص ۲۲۶ ج ۱۔

ہیں ہے ۔ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس کا بالکل صحیح ترجمہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں ”پھر نکالا ان کو“ یہ ”پھر“ حرف ”فا“ ہی کا ترجمہ ہے جیسے خان صاحب ”اور“ بنا گئے تھے۔

خامساً :- احمد رضا خان صاحب نے ”اَخۡرَجَ“ کا ترجمہ ”الگ کر دیا“ کیا ہے حالانکہ اردو میں ”الگ کرنے“ اور ”نکالنے“ کا مفہوم علیحدہ علیحدہ ہے۔ اردو میں دو متصل چیزوں کو علیحدہ کر دینے کے لیے ”الگ کرنا“ استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح کسی منصب، عہدہ اور ملازمت سے علیحدہ کر دینے کے لیے بھی ”الگ کرنا“ استعمال ہوتا ہے لیکن کسی مقام، جگہ اور ظرف سے مظروف کو نکالنے کے لیے ”الگ کرنے“ کا استعمال اصولاً صحیح نہیں الا یہ کہ مجاز کا ارتکاب کیا جائے۔ اس لیے بالکل صاف، واضح اور بے غبار ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا ہے یعنی ”پھر نکالا ان کو“۔

سادساً :- ”بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ“ کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے ”آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن“ اس ترجمہ میں حرف ربط نہ ہونے کے باعث پتہ نہیں چلتا کہ ”ایک تمہارا دوسرے کا دشمن“ ہو گا یا نہیں؟ اس کے برعکس حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ اس سقم سے پاک ہے وہ فرماتے ہیں ”تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے“۔

سابعاً :- ”بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ“ کے ترجمہ میں خان صاحب نے ”آپس میں“ کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں۔ متن قرآن پاک میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ ”آپس میں“ بنتا ہو۔

ثامناً :- ”بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ“ کا بریلوی ترجمہ ”آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن“ اردو کے لحاظ سے بھی درست جملہ نہیں ہے کیونکہ ”آپس میں“

کے الفاظ تعدد کو چاہتے ہیں اس لیے ”تم آپس میں“ یا ”آپس میں تم“ کی ترکیب تو استعمال ہوتی ہے لیکن ”آپس میں ایک تمہارا“ کی ترکیب قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اسی مفہوم کو اگر وہ اس طرح ادا کر دیتے کہ ”آپس میں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے“ تو اردو کے لحاظ سے یہ ترکیب درست ہو جاتی۔

تاسعاً :- ”مُسۡتَقَرٌّ“ کے بارے میں مفسرین کرام ذکر فرماتے ہیں کہ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ”اسم ظرف“ کا صیغہ ہے اور دوسرا یہ کہ مصدر میمی ہے لیکن راجح پہلا احتمال ہے کہ یہ ”اسم ظرف“ ہے دلیل ترجیح یہ ہے کہ جو مفسرین دونوں احتمال ذکر فرماتے ہیں وہ اکثر ”اسم ظرف“ والے احتمال کو مقدم بیان کرتے ہیں مثلاً بیضاوی شریف[1]، روح المعانی، البحر المحیط، النہر الماد لابی حیان برحاشیہ البحر المحیط، مدارک التنزیل و مظہری۔

اس کے برعکس جو مفسرین صرف ایک احتمال کا ذکر کرتے ہیں وہ صرف ”اسم ظرف“ والے احتمال ہی کو متعین فرما کر ذکر کرتے ہیں مثلاً جلالین شریف[2]، روح البیان، تفسیر قرطبی، خازن، معالم التنزیل برحاشیہ خازن، مراح لبید، الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز برحاشیہ مراح لبید، تبصیر الرحمان، تفسیر ابن عباس برحاشیہ در منثور وغیرہ۔ بہرحال حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے جمہور مفسرین کے نزدیک راجح احتمال کو اختیار کرتے ہوئے ”مُسۡتَقَرٌّ“ کو ”اسم ظرف“ قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ ”ٹھکانا“ کیا ہے جس کا معنی منزل اور جائے قرار

---

۱ بیضاوی شریف ص۶۹، روح المعانی ج۱ ص۲۳۶، البحر المحیط ج۱ ص۱۶۴، النہر الماد لابی حیان برحاشیہ البحر المحیط ج۱ ص۱۶۱، مدارک التنزیل ج۱ ص۴۳، مظہری ج۱ ص۵۸، کشاف ج۱ ص۲۷۴۔

۲ جلالین شریف ص۸، روح البیان ج۱ ص۱۱۱، تفسیر قرطبی ج۱ ص۳۲۱، خازن ج۱ ص۵۱، معالم التنزیل برحاشیہ خازن ج۱ ص۵۱، مراح لبید ج۱ ص۱۰، الوجیز ج۱ ص۱۰، تبصیر الرحمان ج۱ ص۱۴، تفسیر ابن عباس ج۱ ص۱۹

کے ہوتے ہیں اس کے برعکس احمد رضا خان صاحب نے ایک مرجوح قول کو اختیار کر کے اس کے مطابق اس کا ترجمہ "ٹھہرنا" کیا ہے۔ بہر حال ان تمام نقائص سے پاک ترجمہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے یعنی

"پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک"۔

<u>آیت (۳۷)</u> فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

احمد رضا خان صاحب نے اس آیت مبارکہ کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے۔

"پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان"۔

یہ ترجمہ متعدد وجوہ سے محل نظر ہے۔

<u>اولاً</u> :- احمد رضا خان صاحب نے "تَابَ عَلَيْهِ" کا ترجمہ کیا ہے "اللہ نے اس کی توبہ قبول کی" حالانکہ "توبہ" کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں۔

والتوبة لفظة يشترك فيه الرب والعبد فاذا وصف بها العبد فالمعنى رجع الى ربه لان كل عاص فهو فى معنى الهارب من ربه فاذا تاب فقد رجع عن هربه الى ربه فيقال تاب الى ربه والرب فى هذه الحالة كالمعرض عن عبده و اذا وصف بها الرب تعالىٰ فالمعنى انه رجع على عبده برحمته و فضله [1]

"توبہ" ایسا لفظ ہے جس میں رب اور بندہ دونوں شریک ہوتے ہیں لہٰذا لفظ توبہ کے ساتھ جب بندہ کو موصوف کیا جاتا ہے تو معنی ہوتا ہے کہ بندہ نے اپنے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، کیونکہ ہر گنہگار بندہ حقیقت میں اپنے رب سے بھاگا ہوا ہے اور جب وہ توبہ کرتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے بھاگنے سے رجوع کرتا ہے ایسی صورت میں کہا جاتا ہے تَابَ اِلٰی رَبِّہٖ یعنی اس نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا اور رب تعالیٰ اس حالت میں (جبکہ بندہ بھاگا ہوا ہو) اپنے بندے سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں اور جب رب تعالیٰ کو توبہ کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے تو معنی ہوتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندے پہ رحمت و فضل کے ساتھ رجوع فرمایا"

ہاں البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندہ پہ رحمت و فضل کے ساتھ متوجہ ہو جانے کو "قبول توبہ" لازم ہے لیکن "قبول توبہ" کو پوری طرح رحمت و فضل کے ساتھ متوجہ ہو جانا لازم نہیں ہے کیونکہ بسا اوقات انسان توبہ تو قبول کر لیتا ہے لیکن دل پوری طرح اس کے بارے میں چونکہ صاف نہیں ہوتا اس لیے معاف کر دینے کے باوجود اپنی رحمت و فضل کے ساتھ پوری طرح اس کی

---

[1] تفسیر کبیر مع ابی السعود ص ۳۱۱ ج ۱

طرف متوجہ نہیں ہوتا اس لیے حاشیۃ الشہاب میں "توبۃ" کے معنی رجوع کو دیگر لازمی معانی پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے۔

وفسر التوبۃ فی "التوّاب" بالرجوع الی المغفرۃ لانہ اوفق بمعناہ اللغوی مع استلزامہ للمعانی الاخر۔[لہ]

اور تَوّاب میں توبہ کی تفسیر مغفرت کی طرف رجوع کرنے سے کی گئی ہے کیونکہ یہ دوسرے معانی کو مستلزم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے لغوی معنی کے زیادہ موافق ہے۔

بہرحال ثابت ہوگیا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ ترجمہ فرمانا کہ "پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر" زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ "اللہ نے اسکی توبہ قبول کی" کیونکہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے ترجمہ سے نہ صرف یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا قبول ہوجانا سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجہات و عنایات کا حضرت آدم علیہ السلام پر مبذول ہونا بھی سمجھا جاتا ہے۔

ثانیاً:- "توّاب" کا ترجمہ خان صاحب نے کیا ہے "بہت توبہ قبول کرنیوالا" اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ہے "توبہ قبول کرنے والا"، یعنی احمد رضا خان صاحب نے مبالغہ کا ترجمہ کیا ہے جب کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے مبالغہ کا ترجمہ نہیں فرمایا ہے۔ اس موقعہ پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمہ کا راجح ہونا سمجھنے کے لیے ایک تو اس بات پر غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں کہیں توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا ہے وہاں مبالغہ کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا

لہ حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ص ۱۴۰/ج ۲

کتابیات

۱ القرآن الحکیم۔

۲ اکلیل فی استنباط التنزیل علی مدارک التنزیل - حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ۔

۳ انوار التنزیل و اسرار التاویل - قاضی ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بن محمد بیضاوی ۷۹۱ھ۔

۴ انوار ساطعہ - از مولوی عبدالسمیع سام پوری۔

۵ املاء ما من بہ الرحمٰن من وجوہ الاعراب والقرآت - ابوالبقاء عبداللہ بن حسین بن عبداللہ العکبری المتوفی ۶۱۶ھ۔

۶ انوارِ رضا - مختلف مقالات کا مجموعہ، مطبوعہ شرکت حنفیہ گنج بخش روڈ لاہور۔

۷ البحر المحیط - محمد بن یوسف الشہیر بابی حیان الاندلسی المتوفی ۷۵۴ھ۔

۸ تفسیر بغوی المعروف بہ معالم التنزیل (علی ہامش الخازن) ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ۔

۹ تفسیر مظہری - قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی نقشبندی المتوفی ۱۲۲۵ھ۔

۱۰ تفسیر القرآن العظیم - ابوالفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ۔

۱۱ التفسیر المنیر لمعالم التنزیل المسمی مراح لبید

لکشف معنی قرآن مجید، الشیخ محمد نووی الجاوی۔

۱۲ تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس، (برحاشیہ الدر المنثور) ابو طاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی المتوفی سنہ ۸۱۷ھ۔

۱۳ تفسیر القرآن الحکیم بہ تفسیر المنار، از علامہ سید رشید رضا مصری المتوفی سنہ ۔

۱۴ تبصیر الرحمان

۱۵ تفسیر ابی السعود (علی ہامش الکبیر) المسمی ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم۔ ابو السعود محمد بن محمد العمادی المتوفی سنہ ۹۵۱ھ۔

۱۶ تسہیل الادب فی لسان العرب المعروف عربی کا معلم مولانا عبد الستار خاں۔

۱۷ جلالین۔ جلال الدین محلی وجلال الدین عبد الرحمن السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ

۱۸ الجامع لاحکام القرآن۔ ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی المتوفی سنہ ۶۷۱ھ

۱۹ جامع البیان عن تاویل ای القرآن۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری المتوفی سنہ ۳۱۰ھ۔

۲۰ حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی۔

۲۱ حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی تفسیر البیضاوی محی الدین شیخ زادہ سنہ

۲۲ حاشیہ سید شریف جرجانی علی الکشف۔

۲۳ خالص الاعتقاد۔ از احمد رضا خان بریلوی۔

۲۴ روح البیان۔ شیخ اسماعیل حقی البروسوی المتوفی سنہ ۱۱۳۷ھ۔

۲۵ الدر المنثور فی التفسیر بالماثور۔ جلال الدین عبد الرحمن السیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ۔

۲۶ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی علامہ ابو الفضل شہاب الدین سید محمد آلوسی بغدادی م سنہ ۱۲۷۰ھ

۲۷ الشاہ احمد رضا۔ از

۲۸ ضیاء کنز الایمان از غلام رسول سعیدی مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور

۲۹ غرائب القرآن و رغائب القرآن (علی ہامش الطبری) علامہ نظام الدین حسن بن محمد بن حسین القمی النیشاپوری المتوفی سنہ ۷۲۸ھ۔

۳۰ فرہنگ آصفیہ، سید احمد دہلوی، مطبوعہ مکتبہ حسن سہیل لاہور۔

۳۱ فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر۔ محمد بن علی بن محمد الشوکانی المتوفی سنہ ۱۲۵۰ھ۔

۳۲ الفتوحات الالٰہیۃ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیۃ (المعروف بہ تفسیر جمل) سلیمان بن عمر العجیلی الشافعی المتوفی سنہ ۱۲۰۴ھ

۳۳ فیروز اللغات، الحاج مولوی فیروز الدینؒ، مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔

۳۴ فتاوی رضویہ۔ از احمد رضا خان بریلوی۔

۳۵ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل۔ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری المتوفی سنہ ۵۲۸ھ۔

۳۶ کتاب الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز (علی ہامش مراح

لبید) امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی المتوفی ۴۶۸ھ۔

۳۷ لباب التاویل فی معانی التنزیل۔ علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی الشہیر بالخازن المتوفی ۷۲۵ھ۔

۳۸ محاسن کنز الایمان، ملک شبیر محمد خان اعوان، مطبوعہ مرکزی مجلس رضا۔

۳۹ مختصر المعانی،

۴۰ مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر۔ امام فخر الدین رازیؒ ابوعبداللہ محمد بن ضیاء الدین عمر بن حسین القرشی المتوفی ۶۰۶ھ مطبوعہ مصر

۴۱ المفردات فی غریب القرآن۔ ابوالقاسم حسین بن محمد المعروف بالراغب الاصفہانی المتوفی ۵۰۲ھ

۴۲ مدارک التنزیل و حقائق التاویل۔ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی المتوفی ۷۰۱ھ۔

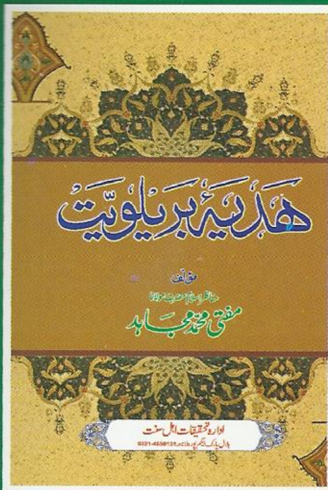
۴۳ مفتاح العلوم،

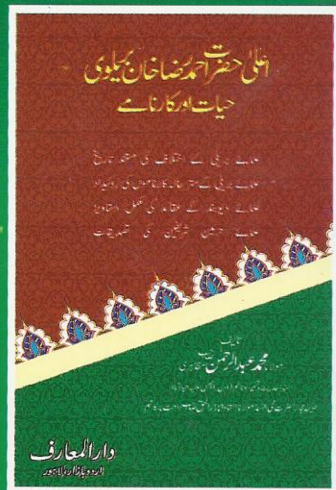
۴۴ مصباح القواعد۔ مولوی فتح محمد خان جالندھری مطبوعہ رام پور ۱۹۲۵ء۔

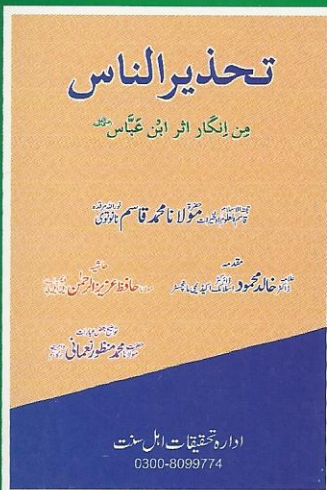
۴۵ مشکوٰۃ المصابیح۔ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی۔

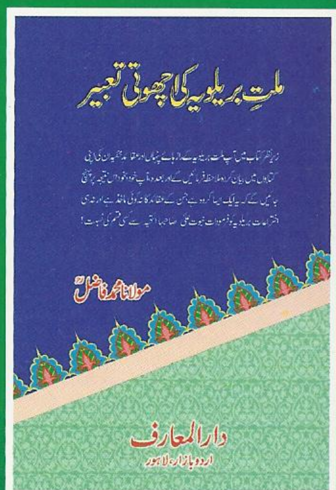
۴۶ مسلم شریف، ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری المتوفی ۲۶۱ھ

۴۷ النہر الماد (علی ہامش البحر المحیط) محمد بن یوسف الشہیر بابی حیان الاندلسی المتوفی ۷۵۴ھ۔









ادارہ تحقیقات اہل سنت

بلال پارک بیگم پورہ لاہور 0321-4650131